رجسٹرڈ ایل نمبر ۳۲۹۸
سلسلہ عالیہ احمدیہ کا
سب سے پہلا مشہور و معروف اخبار جس کو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنا
ایک بازو قرار دیا
رجسٹرڈ ایل نمبر ۳۲۹۸

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ

اخبار
الحکم
ہفتہ وار
قادیان
دور جدید

چہ گوئمت کہ بآں قوم آں چہ بادۂ قادیاں بینی
دوا بینی شفا بینی غرض دار الاماں بینی
بیا در زمرہ مستاں تا بینی عالمے دیگر
بہشتے دیگر و ابلیس دیگر آدمے دیگر

چندہ سالانہ
حکومت اور والیانِ ریاست سے ۱۲ر
امراء و رؤسا سے ۵ر
معاونین سے ۷ر
عوام ۴ر
ممالک غیر سے ۱۲ر
مدینۃ المسیح
قادیان دار الامان سے ہر انگریزی ماہ کی ۷-۱۴ ۲۱-۲۸ تاریخ کو خدا کے فضل سے شائع ہوتا ہے
قیمت فی پرچہ ۲ر

مالک عامل
شیخ یعقوب علی تراب احمدی عرفانی
مدیر مسئول
شیخ محمود احمد عرفانی مجاہد مصری

کتبہ سید محمد باقر خوشنویس قادیان

جلد ۴۱
مورخہ ۲۱/۲۸ اپریل و ۷/۱۴ مئی ۱۹۳۸ء مطابق ۶/۱۳ ربیع الاوّل ۱۳۵۷ھ بروز یکشنبہ
نمبر ۱۲-۱۳-۱۴-۱۵

بخرام کہ وقت تو نزدیک رسید و پائے محمدیاں بر منار بلند تر محکم افتاد (الہام حضرت مسیح موعود)

حضرت بھائی عبدالرحمٰن صاحب قادیانی

سابق

مہتہ ہریش چندر صاحب کے اسلام قبول کرنے کے ایمان افروز حالات

جن میں

حضرت سیدنا مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پاکیزہ صحبت کے اثرات

اور

اسلام کی قوّتِ قدسی اور نور کا تذکرہ کیا گیا ہے

نوٹ:۔ قارئینِ الحکم کی روحانی لذّت اور مسرّت کیلئے ان تمام حالات کو الحکم کے چار نمبروں کو یکجا جمع کر کے بڑی محنت سے شائع کیا گیا
(محمود احمد عرفانی)

اللہ بخش سٹیم پریس قادیان میں باہتمام شیخ محمود احمد عرفانی پرنٹر و پبلشر چھپکر دفتر اخبار "الحکم" تراب منزل قادیان سے شائع ہوا

انصارِ الحکم کا اپنا صفحہ

"الحکم" کو زندہ رکھنا ہر احمدی کا فرض ہے

اخبار "الحکم" سلسلہ عالیہ احمدیہ کا پہلا اخبار ہے۔ اسے سیدنا و امامنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ملفوظات، مکتوبات اور تحریرات کے علاوہ خدا تعالیٰ کی تازہ وحی کے محفوظ کرنے کا فخر ملا۔ اِن خدمات کو خدا کے اس پہلوانِ جلیل نے بارہا سراہا۔ اور پسند کیا۔ اور ان ناچیز خدمات کو مدِّنظر رکھ کر "الحکم" کو

اپنا بازو قرار دیا۔

پس الحکم اس پاک زمانہ کی یادگار ہے۔ اور آج پھر ذکرِ حبیب کی یاد میں رطب اللسان ہے۔ اسلئے میں ان تمام فدایانِ مسیحؑ اور محبانِ احمدؐ کو پکارتا ہوں۔ کہ وہ اٹھیں۔ اور اس اخبار کو جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانے کی یادگار ہے مضبوط چٹان پر کھڑا کر دیں۔ اسوقت مشکلات اور مالی تنگی کا وسیع طوفان چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ اور اس کی زندگی خطرے میں نظر آتی ہے۔

اگر آپ کو اس اخبار سے کچھ بھی ہمدردی ہے۔ اور اگر آپ پسند کرتے ہیں۔ کہ اخبار جو مسیح موعود علیہ السلام کے پاک زمانہ کی یادگار ہے۔ کو جاری رکھا جائے۔ تو اس کا واحد علاج یہ ہے۔ کہ **اگر آپ** خریدار نہیں ہیں۔ تو اس اخبار کے خریدار ہو جائیں۔ اور اگر خریدار ہیں۔ تو پھر آپ کے ذمہ اگر کوئی بھی حساب باقی ہے۔ تو وہ آپ ادا فرمائیں۔ اگر یکمشت ادا نہیں کر سکتے تو دو تین اقساط میں ادا کر دیں

اور اگر آپ

خریدار بھی ہیں۔ اور آپ کے ذمہ کوئی بقایا بھی نہیں۔ تو پھر آپ اپنے دوستوں میں تحریک کر کے کم از کم ایک خریدار جو نقد قیمت ادا کر دے مہیا کر کے اجرِ عظیم کے مستحق ہوں۔

ایک نہایت رنجیدہ انتقال

آہ! حافظ البشیر احمد مبلغ احمدیت

نہائت افسوس سے لکھا جاتا ہے۔ کہ سلسلہ عالیہ احمدیہ کے ایک ہونہار اور نہائت نیک اور پُرجوش مخلص مبلغ حافظ البشیر احمد صاحب مولوی فاضل و مبلغ سلسلہ عالیہ احمدیہ دفعتہً دماغ کی رگ کے پھٹ جانے سے فوت ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

مرحوم مغفور کی وفات ایک قومی صدمہ ہے۔ آپ جناب صوفی علی محمد صاحب کے اکلوتے بیٹے تھے۔ اور جناب خانصاحب مولوی فرزند علی خاں صاحب ناظر بیت المال کے ہمشیرہ زادے تھے۔

قادیان میں ہر ایک شخص نے اس خبر کو نہائت رنج اور دکھ سے سنا۔ آپ کا جنازہ بعد نمازِ عصر باغ میں پڑھا گیا۔ جنازہ کے ساتھ بہت بڑا مجمع تھا۔ مرحوم مقبرہ بہشتی میں دفن کئے گئے۔

صوفی علی محمد صاحب نے اس صدمہ پر صبر کا بے نظیر نمونہ دکھایا۔ اللہ تعالیٰ ان کے قلب کو تسلی اور اطمینان دے۔ اور مرحوم کو جنت کے اعلیٰ مقام پر فائز کرے۔

حضرت خانصاحب حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ سندھ میں ہیں۔ ان کو اس ناگہانی خبر سے بڑا صدمہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اُن کو اور اُن کے خاندان کے تمام ممبروں کو صبرِ جمیل عطا فرمائے

ھدیۂ تبریک

ہم معزز اور محترم ہمعصر جناب میر قاسم علی صاحب ایڈیٹر "فاروق" کو انکے نکاح کی تقریب پر جو رشید احمد خان صاحب پنشنر ہیڈ کانسٹیبل کی صاحبزادی رشیدہ بیگم صاحبہ کے ساتھ ۲ مئی ۱۹۳۸ء بعد نمازِ عصر حضرت مولوی سرور شاہ صاحب نے ایک ہزار روپیہ مہر پر پڑھا۔ ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ اس تعلق کو بابرکت فرمائے۔

خاندان حضرت خلیفۃ المسیح اوّل رضؓ میں

مسرّت افزا تقریب

حضرت خلیفۃ المسیح اوّلؓ کے دوسرے صاحبزادے مولانا عبدالوہاب صاحب عمرؔ کی تقریب رخصتانہ ۱۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو عمل میں آئی۔ برات حضرت خلیفۃ المسیح اوّلؓ کے مکان سے چل کر جناب مفتی فضل الرحمٰن صاحب کے مکان پر ۵½ بجے آئی۔ مفتی صاحب نے مہمانوں کے لئے نواب صاحب کے مکان پر انتظام کیا گیا تھا۔ برات کے علاوہ مفتی صاحب نے بھی اپنے بہت سے احباب کو اس تقریب میں شامل ہونے کے لئے بلا رکھا تھا حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز بھی تشریف فرما تھے۔ دعا سے قبل احباب کی چائے اور فواکہات اور مٹھائی سے تواضع کی گئی۔ اور دعا کے بعد رخصتانہ کی تقریب عمل میں آئی۔

۱۵ اپریل ۳۸ء کو بعد نمازِ مغرب مدرسہ احمدیہ کے وسیع کمروں میں پانسو سے زائد مردوں کو دعوتِ ولیمہ دی گئی۔ اس دعوت میں خاص طور پر بہت سے باہر سے آنیوالے احباب کو بھی مدعو کیا گیا جنہیں آنریبل ڈاکٹر سر محمد ظفر اللہ خاں کا، ممبر آف گورنمنٹ انڈیا۔ اور جناب مولانا عبدالمجید صاحب سالک ایڈیٹر اخبار "انقلاب" لاہور بھی تھے۔ حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ نے اس دعوت میں بھی بنفسِ نفیس شرکت فرمائی۔

ہم اس مبارک تقریب پر صدقِ دل سے دونو خاندانوں کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس تعلق کو ہر طرح بابرکت بنائے۔

تعاون کی ضرورت

ایک نوجوان جو موٹر ڈرائیوری کا کام جانتا ہے۔ عرصہ سے بیکار ہے۔ کوئی صاحب انکو ملازم رکھ سکتے ہوں یا ملازم کرا سکتے ہوں تو وہ اس کارِ ثواب میں تعاون فرما دیں۔

اطلاع بنام ایڈیٹر اخبار "الحکم" قادیان

مولوی صاحب

ایک مولوی صاحب جو پُرانی طرز کے مولوی ہیں۔ اور سلسلہ میں داخل ہیں عرصہ سے بیکار ہیں۔ اور بوجہ بیکاری شدید مالی مشکلات میں مبتلا ہیں۔ ملازمت کے خواہشمند کوئی جماعت یا کوئی دوست ان کو اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے ملازم رکھنا چاہیں تو مجھے اطلاع دیں۔

محمود احمد عرفانی دفتر "الحکم" قادیان

"الحکم" کا آئندہ نمبر مسیح موعود نمبر ہوگا

الحکم کا ہمیشہ یہ طریق رہا ہے۔ کہ ۲۸ مئی کو جو حضورؑ کا یوم وصال ہے۔ ایک سیرت مسیح موعود نمبر شائع کیا کرتا ہے۔ اس سابقہ طریق کے مطابق امسال بھی ۲۸ مئی کو الحکم کا جو پرچہ شائع ہوگا وہ سیرت نمبر ہوگا۔ چونکہ الحکم کا عام حجم ۸ صفحے کا ہے۔ اس لئے یہ نمبر بھی دو نمبروں کا مجموعہ ہوگا۔ یعنی ۲۱ اور ۲۸ مئی کا۔ اسکے بعد انشاء اللہ حسبِ سابق ہر ہفتہ پرچہ شائع ہوتا ہے۔

محمود احمد عرفانی

ذکر حصولِ دولتِ ایمان و خلعتِ اسلام

صحابہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام

حضرت بھائی عبدالرحمٰن صاحب قادیانی

حضرت بھائی عبدالرحمٰن صاحب قادیانی ایک بلند پایہ بزرگ ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے سچے عاشق اور سلسلہ میں فدائیت کی رُوح رکھنے والے بے نفس بزرگ ہیں۔ آپ ہندوؤں سے مسلمان ہوئے تھے۔ آپ نے جناب مرزا برکت علی صاحب آف آبادان کے بار بار کے اصرار پر اپنے اسلام لانے کے حالات قلمبند فرمائے۔ اور میرے بار بار عرض کرنے پر یہ حالات مجھے پڑھنے کیلئے دیئے جن پر میں نے قبضہ کر لیا۔ اور اُن کی مرضی کے خلاف محض اس لئے اِس کو شائع کرتا ہوں۔ کہ ممکن ہے۔ کہ کوئی پیاسی روح اِس کے پڑھنے سے تسلی پائے۔ اور اُسے اسلام کی طرف راہنمائی ہو۔ میں امید کرتا ہوں۔ کہ بھائی صاحب مجھے اِس جسارت اور جرأت پر معاف فرمائیں گے۔

بھائی جی نے اگرچہ مجھے اِس کے شائع کرنے کی اجازت نہیں دی۔ مگر میں اَب اِس چیز کو سلسلہ کی متاع خیال کرتا ہوں۔ اِس لئے میں نے اِس کی جرأت کی ہے۔

"محمود احمد عرفانی"

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہٖ الکریم

خدا کے فضل اور رحم کیساتھ

ھُوَ النّــــــاصِر

استغفر اللّٰہ۔ استغفر اللّٰہ۔ استغفر اللّٰہ ربّی من کل ذنبٍ واتوب الیہ۔ لاحول ولا قوۃ الا باللّٰہ۔ لاحول ولا قوۃ الا باللّٰہ۔ لاحول و لا قوۃ الا باللّٰہ العلی العظیم۔

والدہ محترمہ نے جنم پتری کی رُو سے جو بکرمی سمت و تاریخ بتائی اُس کی رُو سے میری پیدائش یکم جنوری ۱۸۷۹ء کو ہوئی۔ اور میں اپنے والدین کا پلوٹھا بیٹا بنا کنجروڑ دتاں تحصیل شکر گڑھ ضلع گورداسپور میری دادھیال مقام پیدائش ہے۔ میرے والد ماجد کا نام نامی اور اسمِ گرامی مہتہ گورا ندتہ مل اور والدہ مکرمہ معظمہ کا نام پاربتی دیوی ہے۔

میرے والد بزرگوار موہیال قوم کی موہن شاخ اور میری والدہ محترمہ موہیال قوم کی دت شاخ سے تھیں۔

میرے والد محترم کے دو اور بڑے بھائی تھے۔ جن میں سے بڑے کا نام مہتہ میہراج اور چھوٹے کا نام مہتہ لال چند تھا۔ اور میرے دادا بزرگوار کا نام نامی مہتہ ہیرا لال تھا۔

موہیال قوم سات مختلف موہیوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ جن کی تاریخی روایات نہائت ہی شاندار ہیں۔ کئی مبسوط کتب اِس قوم کے تاریخی حالات کی حامل ہیں۔ جن میں سے ایک مختصر سی کتاب "گلشن موہیالی" میں نے بھی ملکانہ دار کے زمانہ میں پڑھی تھی۔ کسی زمانہ میں یہ قوم ہندوستان۔ کشمیر۔ اور کابل تک پر حکومت کی مدّعی ہے۔ اور اپنی بہادری اور تیغ زنی کی روایات پر اُس کو بڑا فخر ہے۔ اور عرب یا عراق عرب اور یونان تک سے اپنے تعلقات بیان کرتی ہے۔ واللّٰہ اعلم

والدہ ماجدہ سنایا کرتی تھیں۔ کہ میرے (راقم کے) آباؤ اجداد ممدوٹ (ضلع فیروزپور میں ایک ریاست ہے) سے تعلق رکھتے تھے۔ اور اُن کو حکومت کے کاروبار میں بڑا دخل و تصرف تھا۔ اور اکثر ریاست کی مشینری کے بہترین پرزے اور نواب صاحب ممدوٹ کے معتمد تھے۔ خاندان میں سے کوئی تعلیم اسلام سے متأثر ہو گیا اور اُس نے اظہارِ اسلام کر دیا۔ جس کی وجہ سے موہن قوم کے افراد نواب صاحب کے مخالف ہو گئے۔ اور جب باوجود مطالبہ و اصرار نواب صاحب نے برضا و رغبت مسلمان ہونے والے کو اُن کے حوالے نہ کیا۔ بلکہ اُس کی حمائت و امداد کی۔ تو ساری موہن قوم نواب صاحب کے خلاف بر سرِ پیکار ہو گئی۔ اور پھر تلوار کو نیام میں نہ کیا جب تک کہ ایک ایک کر کے نواب صاحب کی افواجِ قاہرہ کی تلوار کا لقمہ نہ بن گئے۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی۔ کہ بعض بڈھے بچے اور مستورات کے سوا کوئی باقی نہ بچا۔ اور جو بچا۔ اُس نے ترکِ وطن کیا۔ اور کنجروڑ میں آکر اپنی دت برادری کے پاس بود و باش اختیار کر لی۔

میں ابھی چالیس دن کا بھی نہ ہُوا تھا۔ کہ میری والدہ کو اپنے والد صاحب چوہدری گوپال داس صاحب کے پاس مٹھا چک تحصیل پھالیہ ضلع گجرات میں جانا پڑا۔ اور پھر وہیں میری ابتدائی پرورش ہوئی۔

جس حصہ گاؤں میں میرے نانا رہتے تھے۔ (وہ اس حلقہ کے پٹواری مال تھے) اس میں دو تین گھرانے شریف زمیندار مسلمان بھی رہتے تھے۔ گرمی کے موسم میں ایک رات جبکہ والدہ محترمہ بے خبر سوتی تھیں میں چارپائی سے نیچے گرا۔ اور رو یا کیا۔ مگر والدہ کی نیند نہ کھلی۔ ایک مسلمان معمّر عورت مریم نام جسے محلہ والے ماں مریاں (مریم) کر کے پکارتے اٹھیں اور انہوں نے مجھے محبّت سے گود میں لیا۔ اور باقی رات مجھے نہائت محبّت و مہربانی سے اپنی چھاتی سے لگائے رکھّا۔ والدہ محترمہ کو جب ہوش آیا۔ تو گھبرائیں۔ اور رونے لگیں۔ مگر ماں مریم نے اُن کی تسلّی مجھے دکھا کر کرائی۔ اور والدہ کو نصیحت کی۔ مگر اُسی دن سے ماں مریم کو مجھ سے کچھ ایسی محبّت ہو گئی۔ کہ وہ مجھے رات کو بھی جُدا نہ کرتیں۔ اور اکثر روزانہ مجھے گودی میں لے کر قرآن کریم کی تلاوت فرمایا کرتیں۔

اس زمانہ میں ہندو مسلم تعلقات برادرانہ ہُوا کرتے تھے۔ اور بھائی بندوں کی طرح ہندو مسلمان ایک دوسرے کی خوشی اور غم میں شریک ہوتے تھے۔ چنانچہ میں محترمہ ماں مریم ہی کی گودیوں میں قرآن کریم سنتے سنتے پلا اور بڑھا۔ اکثر وہیں کھا پی بھی لیا کرتا تھا۔ کیونکہ اُس زمانہ میں چھوت کا بھی چنداں رواج نہ تھا۔

جب ہوش سنبھالا اور چار پانچ برس کا ہو گیا۔ تب میرے نانا صاحب بزرگوار نے مجھے تعلیم کی غرض سے جکالیاں (جو تحصیل پھالیہ میں ایک قصبہ ہے۔ اور مٹھا چک سے غالباً تین میل کے فاصلہ پر ہوگا) کے مدرسہ میں داخل کرا دیا۔ جہاں روزانہ میں دوسرے لڑکوں کے ساتھ جاتا۔ روٹی گھر سے پکوا کر لے جاتا۔ اور بھوک لگتی تو وہیں کھا لیا کرتا۔ اور شام کو رخصت ہوتی تو واپس گھر آ جایا کرتا۔

معلوم ہوتا ہے۔ کہ میرے عادات کو جو مسلمان ماں مریم کی صحبت کی وجہ سے اسلامی رنگ میں ڈھلتے جا رہے تھے۔ نانا صاحب نے بدلنے کی پوری کوشش کی ہوگی۔ کیونکہ سکول کی ابتدائی زندگی کا ایک واقعہ مجھے اب تک یاد ہے۔ کہ ایک روز ایک مسلمان لڑکا مجھ سے چھُو گیا۔ جبکہ میرے ہاتھ میں میرا کھانا تھا۔ میں نے وہ کھانا پھینک دیا۔ اور دن بھر بھوکا روتا رہا۔ مجھے یاد پڑتا ہے۔ کہ وہ چھوئی ہوئی خوراک میرے کسی ہندو ساتھی نے اٹھا کر رکھ لی۔ اور جب وہ کھانے بیٹھے۔ تو مجھے بھی میری روٹی کھا لینے کو کہا۔ بلکہ اصرار بھی کیا۔ اور مجھے تسلّی دلائی۔ کہ کچھ ہرج نہیں اور ہم کسی کو بتلائیں گے بھی نہیں۔ وغیرہ۔ مگر میں نے اُس کے کھانے سے انکار پر اصرار کیا۔ اور کہا کہ

بھرشٹ چیز کے کھانے سے موت بھلی لگتی ہے۔ چنانچہ موسم گرما کا لمبا دن پانچ چھ سال کی عمر میں نے پانی پی پی کر کاٹ دیا۔ جب بھوک ستاتی، مدرسہ کے قریب ہی ایک رہٹ والا کنوآں چلتا تھا۔ جاتا اور پانی پی کر پیٹ بھر لیتا۔

ملکی رواج کے مطابق میرے ماں باپ نے بھی اظہارِ محبّت والفت کی غرض سے میرے کان چھدوا رکھے تھے۔ اور ہر ایک کان میں تین سوراخ کرا کے بالیاں اور ہاتھ پاؤں میں جھنجھنے دار کڑے اور پاؤنٹے پہنا رکھے تھے۔

بار بار کنوئیں پر آتے جاتے دیکھ کر کسی سنگدل کو حرص وطمع کی آگ لگی۔ اور ایک مرتبہ جبکہ شدّتِ گرما کی وجہ سے ہُو کا عالم تھا۔ اور ہر طرف سنّاٹا تھا۔ مجھے بھوک بار بار ستاتی اور میں پانی کی طرف دوڑتا۔ اس مرتبہ جو میں گیا۔ تو رہٹ چلانے والے نے موقعہ پا کر ادھر اُدھر دیکھ کر پانی پینے کے گلے میں ایک کپڑا ڈال کر کھینچتے گھسیٹتے ایک گڑھیال کے اندر جا پٹکا۔ اور میرے سینے پر گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گیا۔ میرے گلے کی ہنسلی نہایت بے رحمی سے کھینچ کر اُتاری۔ اور جب درد سے میری چیخیں نکلیں۔ تو اُس نے میرا گلا ایسا دبایا۔ کہ میری آنکھیں باہر نکلنے کو آئیں۔ اور میرا دم ایسا گھٹا۔ کہ میں بے ہوش ہو گیا۔ نہ معلوم پھر کیا ہُوا۔ ہنسلی اور ایک کڑا ہوش آنے پر میرے ساتھ میں نے نہ پایا۔ اور وہ آدمی بھی پھر میں نے نہ دیکھا۔ میں ایسا سہما ہُوا تھا۔ کہ ہوش آتے ہی پاؤں سر پر رکھ کر بھاگا۔ اور سکول جا کر کسی کو نہ بتایا۔ کہ ماجرا کیا ہے۔ البتہ لڑکوں نے میرا حال دیکھ کر اور زیور اُترے ہوئے دیکھ کر ماسٹر صاحب سے کہا۔ انہوں نے مجھ سے ماجرا پوچھا۔ جو میں نے عن ومن سنایا۔ وہ کنوئیں پر گئے۔ اِدھر اُدھر پوچھا۔ مگر انہوں نے کانوں پر ہاتھ رکھے۔ اور کہدیا۔ کہ یہ لڑکا تو ہمارے کنوئیں پر آیا ہی نہیں۔ ہم نے تو اب دیکھا ہے۔ پہلے اس کی شکل تک کے آشنا نہیں۔

شام کو جب گھر پہنچا۔ نانا صاحب کو حال معلوم ہُوا۔ انہوں نے بھی موقعہ پر پہنچ کر دریافت کیا۔ مگر کون اقرار کرتا۔ آخر جان بچی لاکھوں پائے صبر کیا، اور سبق سیکھا اُس دن سے میرے زیور سب اُتار دیئے گئے۔ اور مجھے یاد نہیں کہ پھر میری شادی کے ایّام کے سوا کبھی پہنائے گئے ہوں۔ میرے کانوں کے چھ چھیدوں میں سے چار تو آج بتاریخ ۸/۳۴ ۶ تک موجود ہیں۔ اور یہ تو امید ہے۔ کہ قبر میں بھی میرا ساتھ دیں گے، باقی دو جو کان کے نچلے نرم اور گوشت دار حصّہ میں تھے گو مندمل ہو چکے ہیں۔ مگر نشان اُن کے بھی زندگی بھر جانے والے نہیں۔

معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُس لالچی سفاک کو کوئی کھٹکا ہُوا۔ جبکہ ہنسلی اُتارنے کی وجہ سے میری بلبلاہٹ نکلی۔ کوئی اِدھر کو آتا ہوگا۔ جس کی وجہ سے وہ سنگدل جو ہاتھ آیا۔ اُسی کو غنیمت جان کر بھاگ نکلا۔ بہرحال یہ ایک ایسا سبق تھا۔ جو میرے سرپرستوں کے بھی کام آیا۔ اور میرے لئے بھی خضرِ راہ بنا۔

اُسی زمانہ میں مجھے اپنی والدہ محترمہ کے ہمراہ پاکپٹن جانا پڑا۔ جہاں میرے والد بزرگوار بسلسلہ ملازمت سکونت پذیر تھے۔ جکالیّاں میں بھی ابھی میری تعلیم کے بالکل ہی ابتدائی ایّام تھے۔ نئی جگہ اور نئے حالات کے باعث پاکپٹن میں مَیں سکول نہ جا سکا۔ اور اس کا باعث وہ صدمہ بھی تھا۔ جو والدہ کو میرے زیورات کے واقعہ کے باعث ابھی ابھی پہنچ چکا تھا۔ وہ مجھے آنکھوں سے اوجھل کرنا پسند ہی نہ کرتی تھیں۔ اسطرح یہ دن نازوادا کی وجہ سے کھیل کود میں گذرتے اور پڑھنا تو درکنار پچھلا آموختہ بھی بھول گیا۔

پاکپٹن میں ہمارا قیام چند ماہ سے زیادہ نہ ہُوا۔ اس جگہ کے تین واقعات میں سے دو تو مجھے بھی یاد آجایا کرتے ہیں۔ جن میں سے ایک تو یہ ہُوا۔ کہ مکان کی چھت سے گر کر میری ایک ٹانگ ٹوٹ گئی جسکی وجہ سے والدہ محترمہ کو سخت تکلیف اٹھانا پڑی۔ آخر اللہ پاک نے رحم فرمایا اور ٹانگ اچھی ہو گئی۔ تو ایک روز محترمہ والدہ ماجدہ کے ہمراہ کسی تالاب پر نہانے کو چلا گیا۔ جہاں عورتوں کے نہانے کو الگ ایک پردہ دار چار دلواری بنی ہوئی تھی۔ بڑی بڑی عورتوں اور جوان لڑکیوں کو بے تکلّفانہ نہاتے دیکھ کر میں نے بھی بے ڈھڑک چھلانگ لگائی۔ اور پانی چونکہ بہت گہرا تھا۔ نیچے ہی بیٹھ گیا۔ جب عورتوں کی چیخ پکار سے کچھ بن نہ آیا۔ تو اُن کے واویلا پر کوئی مرد آئے۔ جنہوں نے مجھے نیم جان باہر نکالا۔ اور اِسطرح محض خدا کے فضل سے پھر سے نئی زندگی ملی۔

تیسرا واقعہ مجھے یاد نہیں۔ مگر جنابہ والدہ صاحبہ اُسے ہمیشہ دہرایا کرتی تھیں۔ خصوصاً میرے اِسلام لانے کے بعد جب بھی تشریف لاتیں۔ ایک سرد آہ بھر کر فرمایا کرتیں۔ "بچپن تو پہلے ہی سے ایسے تھے۔ مگر افسوس ہم نے سمجھا نہیں تھا۔" وہ فرمایا کرتی تھیں۔ کہ "قیام پاکپٹن میں ایک روز میں بھی محلہ کی عورتوں کے ساتھ تمہیں (راقم کو) انگلی لگائے بابے کی خانقاہ میں سلام کو چلی گئی۔ جدھر جدھر دوسری عورتیں جاتیں۔ مَیں بھی ساتھ ساتھ جاتی۔ اور جہاں بڑی بوڑھیاں سلام کرتیں سیس نواتیں میں بھی عقیدت سے سر نیچا کرتی۔ اور سلام کر کے چڑھاوا چڑھاتی۔

ایک جگہ ایک سفید ریش سبز عمامہ پوش بیٹھا تھا۔ وہاں بھی سب نے سلام کیا۔ اور میں بھی سلامی ہوئی۔ جب ہم سب عورتیں وہاں سے جانے لگیں۔ اور میں چونکہ بڑی بوڑھیوں کے پیچھے پیچھے رہتی تھی۔ مَیں بھی اُٹھی اور تمہارا (راقم کا) ہاتھ پکڑ کر چلنے کو تھی۔ کہ اُس سفید ریش بزرگ نے روکا۔ اور تمہیں (راقم کو) اپنی طرف بلایا۔ مگر میں نے گھبرا کر تمہارا ہاتھ مضبوط پکڑ لیا۔ اور پھر چلنے لگی۔ کیونکہ میری ساتھی عورتیں چند قدم آگے چل چکی تھیں۔

جب اس سبز عمامہ پوش سفید ریش بزرگ نے دیکھا۔ کہ میں تمہیں (راقم کو) اس کی طرف جانے سے روکتی ہوں۔ تو جوش میں بھرے ہوئے آواز سے بولے۔ "بیٹی! یہ بچہ ہمارا ہے۔ بہتر ہے۔ خوشی سے ہمیں دیدو۔ اس کی پیشانی میں ایک ایسی چیز ہے۔ جو تمہارے کام کی نہیں۔ مان لو۔ تو بھلا ہوگا۔ ورنہ پچھتاؤ گی"۔ واللہ اعلم (یہ ان الفاظ کا خلاصہ ہے میرے لفظوں میں جو وہ اپنی زبان میں فرمایا کرتی تھیں)

والدہ فرمایا کرتی تھیں۔ کہ میں کانپ اُٹھی۔ اور بجائے انگلی لگانے کے جلدی سے گودی میں اٹھا کر وہاں سے ایسی بھاگی کہ ساتھی عورتوں کا بھی مجھے خیال نہ رہا۔ اور پھر میں کبھی بھی اُس خانقاہ میں نہ گئی۔

پاکپٹن کے بعد میں کسی لمبے اور جنگلی سفر کی یاد تو دماغ میں پاتا ہوں مگر نہیں کہہ سکتا کہ کس ضرورت اور حاجت یا انقلاب کے ماتحت وہ سفر میرے والدین کو پیش آیا۔ جس میں مَیں اُن کے ہمراہ تھا۔ مگر اتنا دل پر اثر ہے۔ کہ کوئی مشکلات ضرور تھیں جن کی وجہ سے وہ سفر اچانک ہمیں کرنا پڑا۔

اس سفر کے نتیجہ میں جہاں تک مجھے یاد ہے۔ میں اپنے والدین کے زیر سایہ تحصیل چونیاں ضلع لاہور کے بعض دیہات میں رہنے لگا۔ جو بعض سکھ سرداروں کی ملکیّت تھے۔ (دیر سنگھ والا۔ بھاگو والا۔ گجن سنگھ والا ٹبّی وغیرہ دیہات) اور وہاں میرے والد محترم مختار عام کی حیثیت سے ملازم تھے۔

اس زمانہ میں میرے والد صاحب نے میری تعلیم کا انتظام ایک مقامی پنڈت کی زیر نگرانی کیا جس نے مجھے ہندی تعلیم نوشت وخواند کے ساتھ ساتھ بعض بعض وید منتر زبانی بھی یاد کرانے شروع کر دیئے۔ اور میری زبان کی صفائی اور روانی کی وجہ سے زیادہ تر توجہ استاد صاحب کی زبانی تعلیم پر ہی مبذول ہو گئی۔ اور اس طرح بہت سے وید منتر مجھے یاد ہو گئے۔ جو عام طور پر سکھ سردار اور بڑے بوڑھے شغل کے طور پر مجھ سے سُن کر خوش ہُوا کرتے تھے۔

اُسی زمانہ کا ایک واقعہ اللہ پاک کی قدرت کا کرشمہ مجھے یوں یاد ہے۔ کہ:-

ایک روز میرے والد صاحب نے تالاب کنارے کے سایہ دار درختوں کے نیچے (جہاں عام طور سے دیہاتی لوگ دوپہر کے وقت گھروں سے چار پائیاں بچھا کر سویا کرتے تھے) سے مجھے گھر سے اپنا نیا جوتا لانے کا حکم دیا۔ اور نشان وپتہ بتلایا۔ کہ وہ جوتا کہاں رکھا

ہے۔ کیونکہ گھر میں والد صاحب کے دو جوتے رکھے تھے۔

میں تعمیلِ ارشاد میں گھر پہنچا۔ والدہ محترمہ صحن میں دیوار کے سایہ تلے کسی کام میں مصروف تھیں۔ میں سیدھا اندر چلا گیا۔ مگر مصلحتِ الٰہی اور منشاءِ ایزدی نے میرے دماغ سے مقررہ جوتا اٹھانے کا خیال نکال دیا اور میں بجائے پہلے طاقچہ والے جوتے کو اٹھانے کے کمرہ کے انتہائی گوشہ کے طاقچہ کی طرف چلا گیا۔ جہاں دوسرا جوڑا رکھا ہوا تھا۔ سبحان اللہ۔ سبحان اللہ۔ سبحان اللہ۔ سبحان ذی الملک والملکوت والعزۃ و العظمۃ والھیبۃ والقدرۃ والکبریاء والجبروت۔

میرا اس کونہ میں پہنچنا تھا۔ کہ یکدم سارے مکان کی چھت بیٹھ گئی۔ اور دھڑام کی آواز کی گونج سے محلّہ بھر میں سناٹا چھا گیا۔ اور اتنا گرد و غبار اٹھا۔ جیسے بیسیوں آندھیاں اسی حلقہ میں جمع ہو گئی ہوں۔

اس دھماکے کی آواز کے ساتھ ہی ایک دردبھری چیخ بلند ہوئی۔ اور آن کی آن میں گاؤں بھر کے مرد عورت بچے بوڑھے آہ و بکا کی پکار کی طرف جمع ہو گئے۔

ماں کی ماتما نے میری محسن ماں کو اپنی جان کے خطرہ سے ایک منٹ کے لئے بالکل غافل کر دیا۔ اور وہ بے تابانہ ہرشچندر ہرشچندر پکارتی گرتی ہوئی چھت اور دیواروں کے اندر گھستی چلی گئیں۔ اور قدرت نے بھی اُن کی غیر معمولی طور سے مدد فرمائی۔ کہ وہ ہاتھ پاؤں مارتی گرد و غبار کو چیرتی ہوئی مجھ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئیں۔ جہاں نہائت ہی سہمی ہوئی آواز میں مَیں نے اُن کی پکار کے جواب میں جی کہا۔ وہ میری آواز پر بڑھیں۔ اور مجھ سے لپٹ کر بے ہوش ہو گئیں۔

سینکڑوں لوگ جمع تھے۔ اور وہ حیران تھے کہ دھماکے کے ساتھ ہی نکلنے والی چیخ کس کی تھی۔ اگر عورت کی تھی۔ تو وہ ہے کہاں۔ جان کے خطرہ سے کوئی اندر گھسنے کی جرأت نہ کرتا تھا۔ ایک دوسرے کو اور دوسرا تیسرے کو آگے بڑھنے کو کہتا۔ مگر سوائے ایک مرد کے کوئی آگے نہ بڑھا۔ جو دور سے بھاگے آنے کی وجہ سے اتنا ہانپ رہا تھا۔ کہ دم کھال میں نہ سماتا تھا۔ وہ بے تحاشہ بڑھا اور پکارنے لگا، ہرشچندر! ہرشچندر!

مَیں اب سنبھل چکا تھا۔ مگر والدہ بے ہوش تھیں مَیں نے آواز کا جواب دیا۔ والد صاحب کو تسلّی ہوئی۔ اور وہ مجھ تک پہنچ کر والدہ سمیت زندہ سلامت باہر لے آنے میں کامیاب ہو گئے۔ والدہ محترمہ کے مونہہ پر پانی کے چھینٹے مار مار کر اور حلق میں پانی ڈال ڈال کر اُن کو ہوش میں لانے کی کوشش کی گئی۔ جو چند منٹ میں سنبھل گئیں۔ اور چاروں طرف سے مبارک مبارک کی آوازیں آنے لگیں۔

مَیں اگر مقررہ جوتا اٹھانے کھڑا ہو جاتا۔ تو وہ ایسا موقعہ تھا۔ کہ ٹوٹ کر گرنے والا شہتیر یقیناً میرے سر پر پڑتا۔ جس سے جانبر ہونا ناممکن تھا۔ لہٰذا مشیّتِ ایزدی نے میرے دماغ سے اُس کا خیال نکال کر میری توجہ دوسرے جوتے کی طرف پھیر دی۔ جو مکان کے شمال مشرقی کونہ میں رکھا تھا۔ خدا کی شان کہ جہاں میں کھڑا تھا۔ وہاں صرف چند فٹ چھت نہ معلوم کس سہارے پر کھڑی رہ گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ خدا نے ہاتھ دے کر بچا لیا تھا۔

نہیں معلوم کہ اسی واقعہ سے متاثر ہو کر یا بعض اور تحریکات کے ماتحت والد صاحب کا خیال میری تعلیم کے متعلق تبدیل ہو گیا۔ اور انہوں نے مجھے چونیاں کے سکول میں جو ان مواضعات سے آٹھ دس میل کے فاصلہ پر تھا داخل کرا دیا۔ اور میری رہائش کا انتظام اپنی ایک ہم قوم چچی صاحبہ کے پاس کیا۔ جو کہ اپنے بڑھاپے اور بیوگی کے ایام نہائت صبر اور محنت و مشقت میں کاٹ رہی تھیں۔

چونیاں لاہور کے ضلع کی ایک مشہور تحصیل اور بہت پرانا شہر ہے۔ اِس کے اردگرد پرانے کھنڈرات میلوں تک چلے جاتے ہیں۔ اور سُنا ہے۔ کہ کسی زمانہ میں دریائے ستلج و بیاس دونو مل کر اس کے نیچے بہتے تھے:

میرے خیالات بدستور ہندوانہ تھے۔ دیوی دیوتاؤں کی پوجا پاٹھ اور شوالے مندروں میں جا کر گھنٹے بجانا، جگ راتے اور آرتیوں میں شریک ہونا میرا کام تھا۔ سکول کو جاتے ہوئے اور واپسی پر دیوی دوارہ یا جو مندر راستہ میں پڑتا سر جھکا کر ماتھا ٹیکے بغیر یا پرارتھنا کئے بغیر میں ہرگز نہ گذرتا۔ اور اس کو میں نیکی اور سعادت کا موجب یقین کیا کرتا تھا۔

مجھے خوب یاد ہے۔ کہ میں اپنی قومی رسوم کا نہائت سختی سے پابند تھا۔ اور خوشی سے اُن کی پابندی کیا کرتا تھا۔ خواہ کتنی بھی مجھے تکلیف کیوں نہ ہو۔ میں ہر قسم کے برت رکھتا اور دیانت داری سے ان کو نبھاتا تھا۔ حتّٰی کہ بعض قسم کے برت اسلامی روزہ سے بھی زیادہ لمبے ہُوا کرتے تھے۔ وہ بھی میں رکھتا تھا۔

ہماری قومی رسم کے مطابق گنّا کھانا ایک خاص وقت (غالباً اسوج کے آخر یا کاتک کے شروع تک) تک ممنوع تھا۔ اور خاص پابندی تھی۔ کہ جب تک مقررہ دن باقاعدہ دیوی دیوتا کے سامنے اپنے جسم کا خون بطور بھینٹ نہ چڑھا لیتے گنّا نہ کھایا جاتا تھا میں باوجود بچپن کے صبر کرتا۔ اور اس رسم کو خوشی خوشی ادا کرنے کے بعد گنا کھانے کا نام لیتا۔ دیوی دیوتا کے سامنے نہائت عقیدت اور شوق سے اپنے جسم کا خون گراتا۔ اور اس میں حوصلہ اور برداشت کا غیر معمولی نمونہ دکھایا کرتا۔ جس سے عموماً مجھ سے بڑے بھی گھبرایا کرتے تھے۔

میں عموماً سردی و گرمی میں سویرے اٹھتا۔ اور غسل کے لئے تالاب پر جایا کرتا۔ اور وہ وید منتر (جو دیہاتی زندگی میں مجھے میرے پنڈت استاد نے یاد کرائے تھے۔ اور موجودہ عمر اور مذہبی خیال کی دوری کی تربیت کے باعث وہ روح مجھ میں قائم تھی۔) پڑھ پڑھ کر پوجا پاٹھ اور پرارتھنا کیا کرتا تھا۔

یہ اس زمانہ کے حالات ہیں۔ جبکہ میری عمر نو دس یا گیارہ سال کی تھی۔ یعنی سنہ ۱۸۸۷ء سنہ ۱۸۸۸ء یا سنہ ۱۸۸۹ء کے زمانہ کے آس پاس۔

انہی ایام کا ایک واقعہ مجھے یاد ہے۔ کہ میرے بعض بڑے بھائیوں اور چچا وغیرہ نے جو رشتہ داروں میں سے تھے۔ ایک دن یہ منصوبہ کیا۔ کہ ہرشچندر حقہ نہیں پیتا۔ جس کی وجہ سے اسے چلم کا بھرنا اور سلگانا بھی نہیں آتا۔ اور اِسطرح یہ بڑوں کی خدمت بھی نہیں کر سکتا۔ آؤ اسے حقّہ پلا کر حقّہ کا عادی بنائیں تاکہ یہ بڑوں کی خدمت تو کر سکے۔

سب نے مل کر حقّہ تیار کیا۔ اور مجھے درمیان میں لے کر بیٹھ گئے۔ باری باری کش لگاتے۔ جب میری باری آئی تو مجھے بھی مجبور کیا۔ کہ کش لگاؤں۔ میں نے انکار کیا۔ مگر انہوں نے اصرار کیا۔ اور ناراضگی کی دھمکی اور ناصحانہ رنگ سے مجھے آمادہ کر لیا۔ کہ میں بھی کش لگاؤں۔

میں عادی نہ تھا۔ اور مجھے یہ بھی علم نہ تھا۔ کہ کش کس طرح لگاتے ہیں۔ آخر اُن کے مجبور کرنے پر میں نے ایک لمبا سُوٹا لگا لیا۔ سوٹا لگانا تھا۔ کہ میری آنکھیں پھر گئیں۔ سر میں چکر آ گئے۔ اور متلی ہو کر میں بیدل ہو گیا۔ اور ہوتے ہوتے تکلیف اتنی بڑھی۔ کہ بے ہوشی تک نوبت پہنچ گئی۔ میرا یہ حال دیکھ کر میرے بھائی بند اپنے کئے پر پشیمان ہوئے اور انہوں نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ اور مجھے یہ کہتے ہوئے ہمیشہ کے لئے آزاد کر دیا۔ کہ

"چھوڑو اسے یہ ہمارے کام کا نہیں"۔

اسی زمانہ کا ایک اور تکلیف دہ واقعہ مجھے یاد ہے۔ وہ یہ کہ ایک روز دیرسنگھ والا میں میری ایک خالہ مجھ سے ہنسی کر رہی تھیں۔ انہوں نے مجھے بازوؤں سے پکڑ کر جھکر دیا۔ جس کے نتیجہ میں میری ایک جُن ران میں شدید درد ہو گیا۔ اور بڑھتے بڑھتے ایسا بڑھا۔ کہ میں اٹھنے بیٹھنے تک سے رہ گیا۔ اور آخر نوبت یہاں تک پہنچی۔ کہ گنٹھیہ ہو گیا۔ جس کی وجہ سے میں کئی ماہ تک خطرناک اور ناقابل برداشت دوروں کا شکار بنا رہا۔ اور میرے والدین کو میری اس تکلیف کے باعث سخت مشکلات اور تکالیف کا سامنا ہوا۔ سینکڑوں روپے علاج معالجہ پر صرف کئے مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ جابجا علاج کے لئے مجھے اٹھائے لئے پھرتے۔

مجھے یاد ہے۔ اور میری آنکھیں آج بھی دیکھ رہی ہیں۔ کہ بعض اوقات میرے والد بزرگوار مجھے اپنے کندھوں پر اٹھائے میلوں میل لے جایا کرتے تھے۔ ان احسانات کا خیال دل میں ایک جوش دعا پیدا کرتا ہے۔ مگر کیا کروں اُن سے بھی زیادہ محسن اور شفیق کا حکم کچھ اور ہے۔

آخر عرصہ تقریبًا ایک سال بعد ایک مقامی جراح کے علاج سے (جو بصورت لیپ وغیرہ تھا۔ اور نہائت ہی غلیظ اور بدبودار چیزوں کا لیپ تھا) خدا نے اس گنبھیر کو اندر ہی اندر معدوم کر دیا۔ اور ایسا فضل کیا۔ کہ اب تو مدتوں سے مجھے یہ بھی یاد نہیں۔ کہ وہ تکلیف ہوئی کس ران میں تھی۔ الحمد للہ، الحمد للہ، ثم الحمد للہ

اِن سفروں اور نقل مکانی وغیرہ میں میرے دو تین سال ضائع ہو گئے تھے۔ مگر اب میرے والد صاحب نے فیصلہ کر لیا تھا۔ کہ کچھ ہو کہیں جائیں مجھے بہر حال چونیاں کے سکول ہی میں رکھیں گے۔ چنانچہ پھر میں ۱۸۹۵ء کی جنوری یا فروری تک متواتر اسی سکول میں پڑھتا رہا۔ پہلے دادی صاحبہ کے زیر سایہ اور بعد میں مکرمہ والدہ صاحبہ کی زیر نگرانی۔ اِس عرصہ میں ایک زمانہ ایسا بھی آیا۔ کہ جناب والد صاحب کسی سادھو کی صحبت میں رہنے کے باعث اس کے ایسے گرویدہ ہو گئے کہ ملازمت ترک کر کے اُس کے ساتھ ہو لئے۔ اور دور کہیں گوالیار کے پہاڑوں اور جنگلوں میں اور کہیں ہمالیہ اور بندھیاچل کی چوٹیوں پر بعض جڑی بوٹیوں کی تلاش میں ایسے سرگردان رہے۔ کہ دو تین سال تک اُن کا کوئی پتہ نہ چلا۔ اور والدہ محترمہ نے گھر کا اندوختہ اور ضروریات تک اٹھا اٹھا کر ہماری پرورش کی۔

اسی زمانہ کی ایک یاد آج تک میرے دل میں تازہ ہے۔ کہ مجھے والد صاحب کی گمنامی کا علم ہو گیا (والدہ محترمہ نے باوجود تکلیف اور تنگی کے ہمیں اس بات کا علم نہ ہونے دیا تھا) تو میں نے اپنی مہربان والدہ صاحبہ سے عرض کیا۔ کہ آپ تسلی رکھیں۔ گھبرائیں نہیں۔ میں نے خط لکھنا تو سیکھ لیا ہے۔ اب سکول کو چھوڑتا ہوں۔ اور محنت مزدوری کر کے جو کچھ حاصل کر سکوں گا۔ آپ کی خدمت میں حاضر کر دیا کروں گا۔ آپ میرے بھائی بہنوں کی اچھی طرح سے پرورش کریں۔ اور ان کو اچھی تعلیم دلائیں۔

مجھے یاد ہے۔ کہ میری والدہ صاحبہ پر میرے ان الفاظ کا ایسا اثر ہوا۔ کہ وہ مجھے چھاتی سے لگا کر زار و قطار رونے لگیں۔ اور مجھے تسلی دی کہ نہیں تمہارے ابا کا خط آ گیا ہے۔ وہ جلد آتے ہیں۔

خدا کی شان کہ والدہ نے تو محض میری تسلی کے لئے یہ کہا تھا۔ مگر چند ہی روز گذرے ہونگے۔ کہ والد صاحب کی طرف سے خط اور خرچ آ گیا۔ اور ساتھ ہی اطلاع آ گئی۔ کہ وہ خود بھی جلدی آ رہے ہیں۔ چنانچہ جب وہ تشریف لائے۔ تو اُن کے خیالات مہوسانہ تھے۔ سینکڑوں روپیہ گھر پر آ کر بھی انہوں نے دوائی دارو اور نسخہ جات کیمیا کی نذر کر دیا۔ اور سیکھا تو صرف یہ کہ گندھک اور پارہ کا گلاس بنا لیا کرتے تھے۔ اور بس آخر تنگ آ کر ان چیزوں کو چھوڑا۔ اور پھر ملازمت کا سلسلہ شروع کیا۔ اور پٹوار مال محکمہ سرکار میں حاصل کر لی۔

میں سکول میں تیسری جماعت پاس کر کے چوتھی میں گیا تھا۔ یا کہ چوتھی کے بعد پانچویں میں (کچھ ٹھیک یاد نہیں) اس زمانہ میں جماعت کے کورس میں (ٹیکسٹ بک) ایک کتاب رسوم ہند بھی داخل تھی۔ اور سکول میں سبقًا پڑھائی جاتی تھی۔ میں نے بھی اس کتاب کو پڑھا جس طرح اور ہزاروں طلباء اُسے سالہا سال سے پڑھتے چلے آ رہے تھے۔ مگر

مجھ پر اُس کتاب نے ایسا مقناطیسی اثر کیا۔ کہ میری کایا پلٹ ہو گئی۔ میں ظلمات کی گھٹا سے نکل کر اُجالے میں آ گیا۔ اور میرے خیالات نے ایسا پلٹا کھایا۔ کہ بُت پرستی کے موروثی جذبہ پر بت شکنی و وحدت پرستی کا فطرتی نور غالب آ گیا۔ اور میں قید بُت خانہ و بُتاں سے نجات پا کر خدائے واحد و یگانہ کا آزاد بندہ بننے لگ گیا۔ میرے دل کی کھیتی میں حبِ اسلام کا پہلا پاک اور مقدس تخم اُسی قیمتی کتاب کے مطالعہ سے بویا گیا۔ جس کے مصنف نے نہ معلوم کس پاک نیت اور نیک ارادے سے اِس کتاب میں نور اور ظلمت کو ایسے رنگ میں یکجا جمع کر دیا ہے۔ کہ فطرت سلیم اس سے متأثر ہوئے بغیر رہ ہی نہیں سکتی۔

اور مجھے معلوم ہے۔ کہ میری طرح بہت سے تشنگانِ حق کی سیری کا فخر اس کتاب کو مجھ سے پہلے بھی حاصل ہو چکا ہے۔ اور سینکڑوں گم گشتگانِ راہِ ہدائت کی راہنمائی و راہبری کا وہ موجب ہو چکی ہے۔ قابل اور نیک دل مصنف نے بغیر کسی اشارہ اور بغیر کسی ایک بھی تبلیغی فقرہ لکھنے کے ابتدا میں ہندوؤں کے مذہبی رسوم و رواج اُن کے اکابر کے بعض حالات اور معاشرتی آئین درج کر دیئے ہیں۔ اپنی طرف سے کوئی جرح کی ہے نہ تنقید۔

دوسرے حصہ میں مسلمانوں کے عقائد، رسوم و رواج اور انبیاء کے حالات درج کر کے آخر میں صرف ایک سبق آموز افسانہ لکھ دیا ہے۔ اور بس۔

طرز تحریر بالکل غیر جانب دارانہ ہے۔ اور واقعات مندرجہ کی صحت و اصلیت کی تصدیق کتاب مذکور کو ٹیکسٹ بک (نصاب تعلیم مروجہ وقت) کر کے دونوں قوموں کے نمائندوں نے کر دی تھی۔ کتاب کیا تھی ایک شفاف آئینہ تھا جس میں نور اور ظلمت دونوں کا فوٹو ہو بہو (اس زمانہ کے خیالات اور تحقیق کے مطابق) یکجا جمع تھا۔ اور ہر فطرت اپنی استعداد و قابلیت اور مناسبت کے لحاظ سے اپنے ہمجنس کی طرف جھک جانے پر مجبور تھی۔ چنانچہ اللہ تعالٰے نے ایک زمانہ تک سینکڑوں ہی نیک فطرت انسانوں کی ہدائت و راہنمائی کی عزت اِس کتاب کو بخشی۔ مگر آخر کار متعصب اور مالدار سرکاری اداروں پر قابو یافتہ ہندوؤں کی کوشش کا شکار ہو کر نصاب تعلیم سے خارج کر دی گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

میرے خیالات کا یہ انقلاب ۱۸۸۹ء۔ ۱۸۹۰ء یا زیادہ سے زیادہ ۱۸۹۱ء سے تعلق رکھتا ہے اور اللہ تعالٰے کی شان ہے۔ کہ اسی زمانہ میں چونیاں پر عیسائی مشنریوں نے دھاوا بول رکھا تھا۔ اور ان کے مناد اور پریچر نئے نئے رنگ میں لوگوں کا متاعِ ایمان چھین لینے اور اُن کے مذہبی عقائد پر ڈاکہ ڈالنے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ کبھی تو وہ اپنے خاص انداز اور شان و شوکت کی نمائش کرتے کبھی بچوں اور نوجوانوں کے دل موہ لینے کے وسائل اختیار کرتے۔ اور کبھی کبھی نہائت ہی خوبصورت اشیاء کی تقسیم عام کے ذریعہ سے لوگوں کو اپنی طرف مائل کیا کرتے اور تماشا اور تصاویر دکھا کر نوجوانوں کے دل لبھانے اور طمع دیکر پھانسنے تک سے بھی دریغ نہ کیا کرتے۔

دوسری طرف ہندو قوم چونکہ بڑی ہوشیار اور موقعہ شناس واقع ہوئی ہے۔ اس نے جب عیسائیوں کی سرگرمیوں کو دیکھا۔ تو اپنی نئی پود کو سنبھالنے کی کوشش و فکر میں لگ گئی۔ اور آریوں نے نت نئے جلسے جلوس اور نگر کیرتن کے رنگ جمانے شروع کر دیئے۔ ان کے بڑے بڑے اپدیشک آتے لیکچرز ہوتے۔ اور بحث مباحثے کے اکثر اکھاڑے لگے رہتے۔ اس طرح ہندوؤں نے تو اپنی عقلمندی سے اپنے نوجوانوں کا رُخ پلٹ لیا۔ اور جو رنگ عیسائی مناد اختیار کرتے ہندو بھی اُن سے پیچھے نہ رہتے۔ گانے بجانے میں تو استریوں کی شرکت کیوجہ سے آریوں کے اکھاڑے عیسائیوں سے بھی بارونق ہو جایا کرتے۔ باقی رہ گئے بیچارے مسلمان جو بے سری فوج یا بغیر دولھا کی برات تھے۔ منتشر اور بکھری ہوئی بھیڑوں کی طرح اُن کو جو چاہتا اچک لیتا تھا۔ کوئی نگران تھا۔ نہ پاسبان۔ بعض خاندانی لوگ عیسائیت کا شکار ہو گئے۔ اور بعض آرین خیالات کی وجہ سے دہریہ بن گئے۔

غرض وہ زمانہ بھی عجیب کشمکش کا زمانہ تھا۔ اور چونیاں کا شہر ریلوے سے دور ہونے کی وجہ سے عیسائیوں اور آریوں کا ایک شکار گاہ بن رہا تھا۔ اور عام حالات کے لحاظ سے کہا جا سکتا تھا۔ کہ دونوں کا حملہ اسلام کے خلاف تھا۔

میرے قلب کی بھی عجیب کیفیت تھی۔ اسلام کی محبت میرے دل میں گھر کر چکی تھی۔ اور حلاوتِ ایمانی میرے رگ و پے میں سرائت کر گئی تھی۔ مذہب اور خدا کا خیال میرے دل میں نمایاں جگہ لے چکے تھے۔ اس لئے میں عیسائیوں کے لیکچروں میں بھی چلا جاتا۔ کیونکہ وہ بھی خداوند خدا، خداوند خدا کے نام پر پکارتے

اور بلایا کرتے تھے۔

میں آریوں کے جلسوں اور جلوسوں میں بھی شامل و شریک ہو جایا کرتا۔ کیونکہ وہ بُت پرستی کے خلاف اور توحید کی تائید میں گیت گاتے۔ اور پکار پکار کر ایشور پرماتما اور سرب شکتیمان کے نام پر بلایا کرتے تھے۔

میں خیالات کے لحاظ سے ایک طرف سے تو بالکل کٹ چکا تھا۔ اور نیا پیوند میرا ابھی بالکل تازہ تھا۔ جسے کوئی پانی دینے اور سینچنے والا نہ تھا۔ گو قلبی کیفیت کے لحاظ سے مجھے اطمینان اور تسلّی تھی۔ کہ اسلام (جسے میں ابھی تک صرف نام کے لحاظ سے ہی جانتا تھا اس کی تفاصیل اور کیفیات سے جاہل مطلق تھا) ہی سچا مذہب ہے۔ اور یہ بات میں نہیں سمجھتا۔ کہ کیونکر میرے دل میں میخ فولاد کی مانند گڑ گئی تھی۔ مگر تاہم میں عیسائیوں اور آریوں کی مجالس میں شریک ہوتا۔ کہ شائد وہ چیز جس کی مجھے تلاش ہے۔ انہی کے ہاں سے ملے۔

مگر میں سچ سچ کہتا ہوں۔ کہ مجھے کبھی ایک لمحہ کے واسطے بھی ان دونوں خیالات کے بڑے سے بڑے لیکچراروں کے عالمانہ خطبے اور لیکچر سن کر اس چیز کی صداقت میں شک وشبہ نہ پیدا ہوا۔ جس کو خدا نے اپنے فضل سے خود اپنے ہاتھوں میرے دل میں گاڑ دیا تھا۔ بلکہ میرا ایمان اور یقین اور بھی ترقی کرتا چلا گیا۔ اور اگرچہ اس روحانی پودے کی آبیاری کرنیوالے کوئی بھی ظاہری سامان موجود نہ تھے۔ بلکہ معاملہ اس کے برعکس تھا۔ (کیونکہ مسلمانوں پر مردنی چھائی ہوئی تھی' اور وہ خواب غفلت میں تھے۔ اور کفر موجزن تھا) مگر وہ بیج خدا سے غذا پاتا اور بڑھ کر مضبوط ہی مضبوط ہوتا چلا گیا۔ الحمدللہ

اُسی زمانہ میں اللہ تعالےٰ نے اپنی باریک در باریک حکمت اور مصلحت کے ماتحت یکے بعد دیگرے دو خواب دکھا کر میرے ایمان کو تازہ اور مضبوط بنا دیا۔

پہلا رویاء جو مجھے دکھایا گیا۔ اُس میں قیامت کا نظارہ تھا۔ جو اپنی ساری تفاصیل اور کیفیات (میرے اُس وقت کے خیالات اور علم و وسعت کے مطابق) کے ساتھ مجھے ایک کمرہ کے اندر دکھایا گیا۔ جو بمشکل ۱۰×۱۰ فٹ ہوگا۔ اور وہ اس سکول کا دفتر تھا۔ جس میں مَیں تعلیم پایا کرتا تھا۔ (اُن دنوں چونیاں کا مدرسہ شہر کے جنوبی جانب واقعہ تھا۔ جو بعد میں شہر کے شمالی جانب آبکاری کی جگہ پر نیا سکول بن جانے پر نیلام ہو کر گنک منڈی میں تبدیل ہو گیا)

یہ ایک نظارہ تھا۔ جو مجھے دکھایا گیا۔ اس میں کوئی آئندہ کی خبر تھی نہ علمی بات۔ گو یہ محض ایک نظارہ تھا۔ مگر اس سے میرے قلب کو وہ طاقت ملی اور میرے ایمان میں اتنی تازگی آئی۔ کہ آج تک بھی میں اس اثر اور لذت اور قوت وشوکت کو محسوس کیا کرتا ہوں۔ اور حقیقت یہ ہے۔ کہ واقعی وہ ایک قیامت تھی۔ جو میرے پہلے خیالات پر آئی۔ یا عیسائیوں اور آریوں کے خیالات سُن سن کر اگر کوئی اثر مجھ پر نہاں در نہاں ہوا بھی تھا۔ تو ان خیالات پر بھی وہی قیامت آگئی تھی۔ واللہ اعلم

دوسرا خواب بھی قریبًا قریبًا اسی زمانہ میں یہ دکھایا گیا کہ ایک وسیع اور شفاف قطعۂ آب ہے۔ جس میں بعض آبی جانور بھی کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔ میں اس میں تیرتا اور غسل کرتا پھرتا ہوں۔ پانی اتنا گہرا نہیں۔ کہ مجبورًا مجھے تیرنا پڑتا ہو۔ محض شوق کے طریق سے کبھی تیرتا ہوں۔ اور کبھی کھڑا ہو جاتا ہوں۔ اچانک ایک مگرمچھ (گھڑیال) مجھ پر لپکا۔ اور اس نے مجھے نگلنا شروع کر دیا۔ پہلے پاؤں پکڑے اور ہوتے ہوتے کمر تک مجھے نگل گیا جب میں نے دیکھا۔ کہ میرے جسم کا نصف حصّہ ایک خطرناک اور زبردست دشمن کے قبضہ میں ہے۔ تو معًا کسی بیرونی تحریک کے ماتحت میں نے اپنے دونو ہاتھ پھیلا دیئے اس خیال سے کہ ایسا کرنے سے وہ اَب مجھے نگل نہ سکیگا۔ کیونکہ اس کا مونہہ چھوٹا ہے۔ اور میرے ہاتھوں کا پھیلاؤ بہت وسیع ہو گیا ہے۔

اور ساتھ ہی میں نے دونوں ہاتھوں سے اس مگرمچھ کے مونہہ، سر اور آنکھوں کو نوچنا شروع کر دیا۔ جس کے نتیجہ میں وہ کمر سے آگے نگل بھی نہ سکا۔ بلکہ مجھے چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اور اس طرح میں اُس کے پھندے سے صحیح سلامت بچ گیا۔ اور میرے جسم پر کوئی گزند بھی نہ پہنچا۔ الحمدللہ، الحمدللہ ثم الحمدللہ علیٰ ذالک

میرے خیالات کی تبدیلی اور قلبی انقلاب کا نتیجہ یہ ہؤا۔ کہ مجھے ہندو طلباء اور دوستوں کی بجائے مسلمان طلبأ اور لڑکوں سے محبّت ہونے لگی۔ اور روحانی انقلاب کی طرح جسمانی تعلقات میں بھی ایک نمایاں تبدیلی واقعہ ہوگئی سکول میں کلاس کے اندر اور سکول سے علاوہ اٹھنا بیٹھنا کھیلنا، کودنا، ملنا جُلنا اور چلنا پھرنا غرض عام سوسائٹی کے تعلقات کا نقشہ ہی پلٹ گیا۔

ہمارے استاد ہمیں مضمون نویسی کی مشق کرایا کرتے اور بعض اوقات debate بھی کلاس میں ہؤا کرتی تھی۔ میرے مضامین میں اسلامی رنگ اور debate میں مسلمانوں کا نقطۂ نظر غالب ہونے لگا۔ اور نوبت بعض اوقات یہاں تک پہنچ جایا کرتی۔ کہ بعض متعصب لڑکے بحث سے تنگ آ کر کھلم کھلا مجھے مسلمان یا مسلمانوں کا طرفدار کہنے لگ جاتے۔

میرے سکول کے ہیڈ ماسٹر اس زمانہ میں ایک مسلمان مولوی فاضل ومنشی فاضل مولوی جمال الدین صاحب آف للیانی متصل قصور تھے۔ اور اُن کے نائب ایک صاحب منشی یا مولوی عبداللہ صاحب تھے۔ جو وہ بھی غالبًا اُسی قصبہ للیانی ہی کے باشندے یا اُس کے آس پاس کے رہنے والے تھے۔ اور دو اُستاد ہندو اور سکھ تھے۔ مضمون نویسی کا بچپن ہی میں مجھے زیادہ شوق تھا۔ اور اس کی بڑی وجہ یہ ہوئی۔ کہ "رسوم ہند" کے مطالعہ کا اثر میرے دل پر نہائت گہرا اور پائیدار تھا۔ میں اُسی اثر کے ماتحت مضامین میں سادگی سے اپنی قلبی کیفیات کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ جس سے ہندو طلباء جو زیادہ متعصب اور آریہ خیالات میں پرورش پاتے تھے۔ خواہ مخواہ کھینچ تان کر مجھے اپنا مدّمقابل بنا لیتے اور اسطرح بحث شروع ہو جاتی۔ اور یہی وجہ ہوئی۔ کہ ہوتے ہوتے میرے خیالات اور بھی زیادہ وسیع اور پختہ ہوتے چلے گئے۔ اور مجھے ہندوؤں سے نفرت اور مسلمانوں سے محبت بڑھنے لگی۔ آخر یہ ہؤا۔ کہ میری نشست و برخواست اور ربط واختلاط مسلمانوں سے بہت بڑھ گیا۔ اور ہندوؤں سے قریبًا قریبًا میں کٹکر الگ ہی ہو گیا۔ اور اَب میں بجائے منادر و شوالوں اور دیوی دواروں کے مساجد کے دروازوں پر جا کھڑا ہوتا کبھی اُن کی چار دیواری پر بیٹھ کر صفیں باندھے قطار در قطار کمربستہ کھڑے مسلم نمازیوں کو خدا کی عبادت کرتے اس کے حضور گرتے اور اسی سے دعائیں کرتے دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں لطف اٹھاتا۔ اور اثرات قبول کیا کرتا۔ خصوصًا جبکہ نماز باجماعت ہو رہی ہوتی اور مسلم لوگ قطار در قطار صفوں میں کھڑے ہوتے کبھی رکوع کرتے اور کبھی سجدات میں گر جاتے۔ یہ نظارہ میرے لئے نہائت ہی دلکش، دلآویز اور رُوح پرور ہؤا کرتا تھا۔

میں عید کے روز عیدگاہ کی چار دیواری پر جا بیٹھتا اور جمعہ کو جمعہ پڑھنے والوں کے حرکات کو محبّت بھری نگاہوں سے جمعہ مسجد کے صحن یا چار دیواری سے جھانک جھانک کر اپنی روحانی ترقی کے سامان اور قلبی مسرّت حاصل کیا کرتا تھا۔ اور اُن باتوں کے لئے میرا کوئی بھی ظاہری محرک نہ تھا۔ صرف میرے دل کی خواہش اور روحانی تحریک ہی میری محرک ہؤا کرتی تھی اَب مجھے بجائے بُت گروں اور بُت پرستوں کے موحدوں۔ خدا پرستوں اور بُت شکنوں سے محبّت تھی۔ اور بجائے بت خانوں اور بُت کدوں کے مساجد اور عیدگاہیں میری روحانی دلچسپی کا موجب تھیں۔ گھنٹے اور گھڑیال جو منادر و بُت کدوں سے صبح و مسا بجتے وہ میری توجہ کو اب پھیرنے سے قاصر تھے۔ مگر میرے تیز چلتے ہوئے قدم دوڑتے ہوئے پاؤں اور بھاگتا ہؤا جسم رُکتا اور قدم لرزہ کھا جاتے۔ تو اس خدائے برتر کے نام سے شروع ہونے والی آواز پر جو کہ اللہ اکبر، اللہ اکبر سے شروع ہؤا کرتی تھی مسجد کے صحن یا مینار سے میں جہاں بھی ہوتا۔ جدہر بھی جا رہا ہوتا جس حال میں بھی ہؤا کرتا۔ اذان کے پہلے لفظ پر ہی کھڑا ہو جایا کرتا تھا۔ اور نہ چلتا اور مونہہ پھیرتا جب تک کہ وہ مقدس آواز پوری ختم نہ ہو جاتی۔

میں اذان کے کلمات سے بھی ناآشنا تھا۔ اسکے معانی ومقاصد سے بھی ناواقف تھا۔ مگر دل میں اس طریق پکار، طرز ندا اور نام خدا کی ایک ہیبت ایک

ادب اور ایک قسم کا جوش و نشہ آجایا کرتا۔ کہ بغیر کسی گذرنے والے ہندو وطعنہ زن کے طعنہ کی پرواہ کے مقام ادب پر کھڑا ہو جایا کرتا تھا۔ اور اُس میں مجھے ایک ایسا لطف لذت اور سرور ملتا تھا۔ جس کا میں بیان بھی نہیں کر سکتا۔ گو یہ اس وقت کے مسلمانوں کی تقلید ہی تھی۔ مگر حق یہ ہے کہ مجھے اِس راہ سے بھاری برکت ملی۔

مسلمانوں کا اُس وقت یہ حال تھا۔ کہ میرے ہیڈ ماسٹر سے لیکر ہم جماعت مسلمان لڑکوں حتّٰی کہ بعض میرے خاص دوستوں تک نے بھولے سے بھی مجھے کبھی کوئی کلمۂ خیر نہ کہا۔ اور نہ ہی اس کی اُن کو توفیق رفیق ہوئی۔ میں دن اور رات اُن کے ساتھ رہتا۔ پڑھتا بھی اور کھیلتا بھی۔ مگر کبھی کسی نے بھولے سے بھی مجھے تبلیغ نہ کی۔ حتّٰی کہ بعض اوقات میں خود بازار سے نماز کی کتاب خرید کر تنہائی میں بعض دوستوں کے گھر پر پہنچا۔ اور چاہا کہ وہ مجھے نماز کا سبق پڑھائیں۔ مگر انہوں نے کبھی کوئی عذر کر کے ٹال دیا۔ اور کبھی کوئی بہانہ بنا کر معذرت پیش کر دی۔

راہ نجات، طریق النجات اور بعض اور اردو کتب و رسائل جن کا مجھے پتہ ملتا کبھی کہیں سے کبھی کہیں سے حتّٰی کہ بعض اوقات بمبئی تک سے بعض رسائل میں ٹکٹ بھیج کر منگواتا۔ پڑھتا اور لڑکوں میں تقسیم بھی کر دیا کرتا تھا۔

بعض سادات گھرانے اور قاضی فیملی شہر میں صاحب ثروت اور علم دوست بھی تھے۔ اور میرے انہی لوگوں سے تعلقات محبت بھی تھے۔ مگر اُن کی دوستی اور محبت و وفا بھی صرف دوستی تک ہی محدود تھی۔ جسمانی تعلقات سے آگے روحانی بہبودی اور بھلائی کا کبھی کسی کو خیال بھی نہ آیا۔ مگر میں اُن کی محبت اور صحبت سے فیض یاب ہوتا گیا۔ اور میری روحانی تربیت گو انہوں نے نہ کی۔ مگر ان لوگوں کے تعلقات کا اثر ضرور مجھ پر ہوتا ہی چلا گیا۔ اور وہ بیج جو اللہ پاک نے "رسوم ہند" کے ذریعہ میرے دل میں خود اپنے ہاتھ سے گاڑا تھا۔ اُگ کر پودہ بنتا گیا۔ اور وہ صرف اور صرف اللہ تعالےٰ ہی کی آبیاری سے سینچتا اور بڑھتا گیا۔

مجھے خوب یاد ہے۔ کہ رات کو سوتے وقت میں اِس بات کا خاص طور سے اہتمام کیا کرتا تھا۔ کہ میری چار پائی ایسے رُخ نہ بچھے کہ پاؤں قبلہ کی طرف ہوں اور اگر کبھی والدہ محترمہ چار پائی اُسی طرح بچھا دیتیں تو میں کوشش کر کے بجائے مشرق کے مغرب کو سرہانہ بنا کر سویا کرتا۔ مجھے یہ بھی یاد ہے۔ کہ بعض اوقات باوجود کوشش کے والدہ مجھے مجبور کرتیں۔ کہ اسیطرح سو جاؤں۔ جسطرح انہوں نے چار پائی بچھائی ہوتی تو گو میں اُن کے حکم کی وجہ سے اُسی رُخ سو جاتا مگر سوتے میں اُٹھ کر غلبہ خیال کے باعث میں پاؤں بجائے قبلہ کے مشرق کو کر لیا کرتا تھا۔ اور والدہ صبح کو دیکھ کر خفا بھی ہُوا کرتیں۔ کہ یہ کیا عادت ہے تم سرہانے کی بجائے پائینتی کی طرف سو جاتے ہو۔

خدا کا کرنا ایسا ہُوا۔ کہ ۱۸۹۴ء و ۱۳۱۱ھ کے ماہ رمضان المبارک میں مہدئ آخرالزماں کے ظہور کی مشہور علامت یعنی کسوف اور خسوف پوری ہو گئی۔ آج تک وہ نظارہ میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اور وہ الفاظ میرے کانوں میں گونجتے سنائی دیتے ہیں۔ جو ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب مولوی جمال الدین صاحب نے اس علامت کے پورا ہونے پر سکول کے کمرہ کے اندر ساری جماعت کے سامنے بولے تھے۔ کہ:-

"مہدئ آخرالزمان کی اَب تلاش کرنا چاہیئے۔
وہ ضرور کسی غار میں پیدا ہو چکے ہیں۔ کیونکہ
اُن کے ظہور کی بڑی علامت آج پوری ہو چکی"۔

میں بھی جماعت میں موجود تھا۔ وہ کمرہ وہ مقام، اور لڑکوں کا وہ حلقہ اب تک میری نظر کے سامنے ہے۔ وہ کرسی جس پر بیٹھے ہوئے مولانا نے یہ الفاظ کہے۔ وہ میز جس پر ہاتھ مار مار کر لڑکوں کو یہ خبر سنائی خدا کے حضور ضرور اس بات کی شہادت دیں گے۔ کہ مولوی صاحب موصوف پر اتمام حجت ہو چکی۔

"مہدئ آخرالزمان" میرے کان ابھی تک اِس نام سے ناآشنا تھے۔ اُن کا "کسی غار میں پیدا ہونا" "اُن کے ظہور کی بڑی علامت"۔ یہ الفاظ میرے واسطے اور بھی اچنبہ تھے۔ میں مڈل میں تعلیم پاتا تھا۔ طبیعت میں ٹوہ کی خواہش پیدا ہوئی۔ اُستاد سے بوجہ حجاب اور ادب نہ پوچھ سکا۔ آخر ہم جماعتوں سے اس معمہ کا حل چاہا۔ جنہوں نے اپنے مروجہ عقیدہ وخیال کے مطابق مجھے سارا قصہ کہہ سنایا۔ عام مسلمانوں میں ظہور مہدی آخرالزمان کے متعلق جو خیالات، روایات اور قصے کہانیاں، رائج تھیں۔ اور مہدئ آخرالزماں کے ظہور سے مسلمانوں کی جو امیدیں وابستہ تھیں۔ وہ زبان زدِ خلائق ہیں۔ اُن کے دُہرانے کی ضرورت نہیں۔ میرے دل میں جو باتیں ان قصّوں کو سُنکر پیدا ہوئیں۔ اور جنہوں نے میری روحانیت میں اور اضافہ کیا۔ وہ ذیل کی چند باتیں ہیں۔

۱- تیرہ سو سال قبل ایک واقعہ کی خبر دینا۔ جو دوست دشمن میں مشہور ہو چکی ہو۔ اور پھر اس کا عین وعدہ کے مطابق پورا ہو جانا۔

۲- وہ واقعہ انسانی کوشش کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ آسمان پر ہُوا۔ جہاں انسان کی پہنچ نہیں۔ اور نہ ہی انسان کا کسی قسم کا اُس میں دخل ہے۔

۳- مہدی آخرالزماں کی شخصیت۔ اُس کا کفر کو مٹانا۔ اسلام کو بڑھانا۔ اور اسلامی لشکر تیار کر کے کافروں کو تلوار کے گھاٹ اتارنا۔ اور مسلمانوں کی فتوحات کے خیالات۔

۴- دعا اور اُس کی حقیقت۔ خدا کا بندوں کی دعاؤں کو سُننا اور قبول کرنا۔ کیونکہ اولیاءِ اُمّتِ محمّدیہ مہدئ آخرالزماں کے لئے دعائیں کرتے رہے ہیں۔ آخر وہ قبول ہوئیں۔

۵- یہ باتیں اسلام کی صداقت کی واضح اور بیّن دلیل ہیں۔ اور اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے۔ جو خدا کو پیارا اور خدا تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔

یہ پنجگانہ امور اپنی مجمل سی کیفیت کے ساتھ میرے دل پر اثر انداز ہوئے۔ اور اس واقعہ نے میرے ایمان میں ترقی و تازگی اور روحانیت میں اضافہ کر دیا۔ اور میں بھی مہدئ آخرالزمان کو پانے کے لئے بیتاب ہونے لگا۔ جس کے حصول کے لئے مجھے دعاؤں کی عادت ہو گئی۔

میں راتوں کو بھی جاگتا۔ اور دن میں بھی بے قرار رہتا۔ اور مہدی آخرالزمان کی تلاش کا خیال بعض اوقات ایسا غلبہ پاتا۔ کہ میں دیوانہ وار جنگل میں نکل جایا کرتا۔ اور پکار پکار کر اور بعض اوقات رو رو کر بھی اللہ تعالےٰ کے حضور اس مقدس وجود کے پانے کے لئے التجائیں کیا کرتا تھا۔

چونیاں شہر اور اس کے نواحی کھنڈرات جن لوگوں نے دیکھے ہیں۔ وہ اندازہ کر سکتے ہیں۔ کہ وہ کھنڈرات کتنے پیچیدہ۔ بھیانک اور ڈراؤنے واقعہ ہوئے ہیں۔ اور اُن کا سلسلہ کتنا لمبا اور خطرناک چلا گیا ہے۔ خصوصًا متّو شاہ مقبرہ کے گرداگرد اور اُس سے بھی آگے ہندو مندر کے آس پاس۔ مگر میں باوجود اپنی اس کم سنی کے تنہائی کی تلاش میں اور اس خیال سے کہ کوئی متنفس میری آہ وبکا اور دعا و پکار کو سُن نہ پائے بے دھڑک شوق سے ان کے پیچ در پیچ غاروں کے اندر چلا جاتا اور دل کھول کر دعائیں کیا کرتا تھا۔

ان واقعات کو سننے یا پڑھنے والے تو تعجب کرینگے ہی مگر میں خود بھی اپنے اُن حالات کو سامنے رکھ کر بیحد متعجب ہُوا کرتا ہوں۔ اور حقیقت یہی ہے۔ کہ وہ حالات تھے بھی حیرت ناک اور تعجب انگیز۔ اور اُن میں دیوانگی اور جنون کا رنگ پایا جاتا تھا۔ میں مجلسی زندگی سے متنفر اور تنہائی پسند ہو گیا۔ اور آبادی کی نسبت جنگل اور ویرانے مجھے بھانے لگے۔ اور اسی میں میری راحت خوشی اور سارا سرور ہُوا کرتا تھا۔

میں کھیل کود کا مشتاق تھا۔ میرا بدن چھریرا مگر مضبوط تھا۔ سکول کے جمناسٹک ماسٹر جسمانی ورزش کے کرتبوں۔ دوڑ۔ پھاند اور کرکٹ کی وجہ سے خوش تھے۔ مگر یہ ساری باتیں ایک عرصہ کے لئے مجھ سے جُدا ہو گئیں۔ اور مجھے کسی چیز سے سوائے تنہائی میں دعا کے دلچسپی باقی ہی نہ رہ گئی۔

اور یہ سب کچھ محض اللہ تعالےٰ کے فضل سے تھا، میری عقل، تدبیر یا کوشش کو قطعًا اس میں کسی قسم کا دخل نہ تھا۔ جس طرح اللہ تعالےٰ نے خود میری خواہش بلکہ علم کے بھی بغیر میرے سینہ و دل میں ایمان

کا بیج بویا۔ شگوفہ نکالا، اور اس کی آبیاری فرما کر پودا بنا دیا اسی طرح غیب ہی سے اُس نے خود سارے سامان اس کی حفاظت اور ترقی کے بھی جمع فرما دیئے۔ مجھ سے اگر کوئی دلیل کا طالب ہوتا۔ تو مَیں نفی میں جواب دیتا۔ اور صرف یہ بتا سکتا۔ کہ میرے دل میں اُن صداقتوں کا آفتاب اور مہتاب کے وجود کی طرح یقین ہے۔ اس کے سوا کوئی دلیل نہ تھی۔ کیونکہ میں نے اس نور کو کسی دلیل سے حاصل نہ کیا تھا۔ بلکہ خود خدا نے مجھے وہ نور دیا تھا۔

یہ سلسلہ کم و بیش جاری ہی تھا۔ کہ اللہ تعالےٰ نے ڈاکٹر سید میر حیدر صاحب کو چونیاں میں پہنچا دیا (ڈاکٹر صاحب موصوف حضرت میر حامد شاہ صاحب سیالکوٹی رضؓ کے رشتہ دار تھے) ڈاکٹر صاحب کے ایک صاحبزادے سید بشیر حیدر صاحب میرے کلاس فیلو بنے۔ جن سے مجھے خاص طور سے محبت تھی۔ اور وہ بھی مجھ سے بہت مہربانی و محبت سے پیش آیا کرتے تھے۔ سید بشیر حیدر صاحب کا چونیاں آنا۔ میرا کلاس فیلو بننا اور مجھ سے تعلق محبت پیدا کر لینا میرے لئے اَور بھی رحمت و برکت کا موجب ہو گیا۔ اور اُن کے آنے سے میری زندگی کا ایک بالکل نیا دور شروع ہو گیا۔

سید بشیر حیدر صاحب کے بڑے بھائی مکرم سید نذیر حیدر صاحب بھی ڈاکٹر صاحب موصوف کے ہمراہ ہی چونیاں میں تھے۔ اور وہ بھی مجھ سے بحُسنِ سلوک پیش آتے اور محبت و مروّت کا معاملہ فرماتے۔ مگر وہ چونکہ مجھ سے عمر میں بڑے تھے۔ میں بوجہ ادب اُن کے سامنے کم آتا تھا۔ تاہم وہ بھی ہر لحاظ سے ہماری تربیت کا خیال رکھا کرتے اور موقعہ و محل پر نصیحت و خیراندیشی کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھتے۔

عجیب اتفاق کی بات ہے۔ کہ اُس زمانہ میں بھی میرے دوست مجھے "بھائی جی" کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ اور مجھے عزت و محبت کی نظر سے دیکھا کرتے اور مجھے بھی یاد ہے۔ کہ میں عموماً اپنے دوستوں کو نیکی کی ترغیب دلاتا رہتا تھا۔ حتّٰی کہ بعض اوقات اُن کو تحریص دلانے کی خاطر میں خود روزے بھی رکھا کرتا تھا۔ جس سے میرے دوست متأثر ہوتے اور روزے رکھنے لگ جایا کرتے۔ غرض وہ لوگ میرے اور میں اُن کا خیر خواہ تھا۔ اور ہم لوگ ایک دوسرے کو نیکی کی ترغیب دلاتے اور بُرائی اور بدیوں سے روکا کرتے تھے۔ ہم لوگ ہم عمر تھے۔ نوجوان تھے اور ہماری ایک پارٹی تھی زبردست ہم لڑتے بھی تھے مگر اشرار سے۔ ظالم اور بدمعاشوں سے بازی اور ظلم کو مٹانے کی خاطر نہ کہ نیکی سے روکنے کی غرض سے۔

الغرض ایک عجیب زمانہ تھا۔ اور جب اس کی یاد آتی ہے دل خوشی سے بھر جاتا ہے۔ اور وہ سب دوست نظر کے سامنے آ جاتے ہیں۔ جو آج بالکل جدا جدا ہیں۔ غالباً ۱۸۹۴ء کا آخر تھا۔ کہ میرے چھوٹے بھائی (بہاری لال مہتہ جو فوت ہو چکے ہیں۔ اور چند بچے اپنی یادگار چھوڑ گئے ہیں) کی کسی مسلمان لڑکے سے لڑائی ہو گئی۔ لڑائی میں مسلمان لڑکا مغلوب ہو گیا۔ اور اس نے اپنے بچاؤ کے لئے اُس راز کو بھی قربان کر دیا۔ جو میرے خیالات کے متعلق مسلمان لڑکوں کے خاص حلقہ میں مدت سے بطور امانت چلا آ رہا تھا۔ اور میرے بھائی سے یوں مخاطب ہُوا۔ کہ

"آپ کے بڑے بھائی تو مسلمان ہیں مسلمانوں سے محبت و ہمدردی رکھتے ہیں۔ مگر آپ مسلمانوں سے لڑائی کرتے ہیں۔"

اِن الفاظ نے میرے عزیز پر بجلی کا اثر کیا۔ اُن کے جسم پر ایک لرزہ آ گیا۔ اور ان کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اِس طرح وہ مسلمان لڑکا تو بچکر بھاگ گیا۔ مگر میرا چھوٹا بھائی چند لمحہ حیران و ششدر رہ کر آخر جوشِ غیض میں رونے لگا۔ اور روتے ہی روتے گھر پہنچا۔ والدہ نے ماجرا پوچھا۔ تو دیر کے بعد روتے روتے وہی قصہ کہ سنایا۔ کہ مجھے آج فلاں لڑکے نے کہا ہے۔ کہ

"تمہارا بڑا بھائی مسلمان ہو گیا ہے۔"

والدہ محترمہ سنجیدہ اور عقلمند خاتون تھیں۔ انہوں نے بات کو ٹال دیا۔ اور میرے عزیز کے خیال کو کسی دوسری طرف لگا کر وقت گزار دیا۔ بچوں کی ناراضگی اور جوش وقتی ہوتا ہے۔ آخر وہ بات اُن کے دل سے تو نکل گئی مگر والدہ محترمہ نے بغیر اس کے کہ مجھے اشارہ میں ایک لفظ بھی کہا ہو نہائت احتیاط سے اور محتاط لب و لہجہ سے میرے والد صاحب کو اطلاع کر دی۔ جو ان دنوں چکّے ماڑی کے نہری بنگلہ پر ٹپوادی تھے۔ لائل پور بڑی نہر سے جانب غرب واقعہ ہے۔ یہ بنگلہ نہر کے کنارے جانب شرق واقعہ تھا۔ اور لائل پور کا شہر اس زمانہ میں ابھی آباد نہ تھا۔ بلکہ جہاں اب شہر ہے۔ بالکل جنگل اور بیابان تھا۔

میرا چونکہ امتحان مڈل قریب تھا۔ جو کہ اس زمانہ میں لاہور جا کر دینا پڑتا تھا۔ اس وجہ سے والد صاحب نے بھی ضبط کیا۔ اور وہ دن خاموشی سے گزار دیئے۔ مگر میرے امتحان مڈل اور اس کے نتیجہ نکلنے کے مابعد غالباً فروری یا مارچ ۱۸۹۵ء میں (ان دنوں میں ماہ رمضان کا مبارک مہینہ تھا۔) اچانک دو تین گھوڑیاں اور ایک اونٹ لے کر سارے کنبہ کو چونیاں سے لیجانے کی غرض سے تشریف لے آئے۔ اور اَب بھی والد صاحب نے مجھے اُس اَمرِ معلوم کے متعلق کچھ نہ کہا سُنا بلکہ اپنی تنہائی اور تکلیف کی وجہ بتا کر ہم سب کو تیاری کا حکم دیا۔ مکرمہ والدہ صاحبہ کو چونکہ یقین تھا۔ کہ ہم لوگ اب چونیاں میں نہ رہ سکیں گے۔ لہٰذا انہوں نے اندر ہی اندر رختِ سفر سمیٹ سنبھال کر نیم سی تیاری کر رکھی تھی۔ اس وجہ سے بالکل ہی اچانک اور غیر معمولی جلدی میں ہماری چونیاں سے روانگی ہو گئی۔

میرے والد صاحب کے تشریف لاتے ہی مجھے اور میرے تمام دوستوں کو آنے والی جدائی کا احساس پیدا ہو گیا۔ جس کے بعد بمشکل ایک دن اور ایک رات ہمیں مل بیٹھنے کو نصیب ہوئی۔ میرے دوست میری جدائی کی وجہ سے اور میں اُن کی جدائی کے خیال سے بیتاب و بے قرار تھے۔ مگر کچھ پیش نہ جاتی تھی۔ نہ کوئی حیلہ نظر آتا تھا۔ امتحان مڈل میں فیل تھا۔ میں نے کوشش کی۔ کہ نئے سال کی جماعت بندی کی تعلیم کے حرج کے خیال کی مدد لوں۔ مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ اور والد صاحب نے یہ کہہ کر انکار کر دیا۔ کہ لاہور کے ڈی اے وی سکول میں بھیجینگے۔ والد صاحب کے اُن الفاظ نے میرے پر اور بھی رنج و الم اور یاس و قلق کا پہاڑ گرا دیا۔ جس سے درد کی کوئی انتہا ہی نہ رہی۔

دوستوں سے مشورے کئے۔ حقیقت سنائی۔ مگر کچھ نہ بنا۔ آخر اس سمجھوتے پر کہ وہ لوگ میرے لئے رمضان میں دعائیں کریں گے۔ اور خط و کتابت بحروف انگریزی (کیونکہ والد صاحب انگریزی نہ جانتے تھے) جاری رکھ کر تعلق قائم رکھیں گے۔ اُسی رمضان المبارک میں سحری کے وقت جبکہ بندگانِ خدا اپنے خالق و مالک کے حکم کی تعمیل میں سحری پکانے کھانے میں مصروف تھے۔ یا بعض صالح اور نیک دل پاک نفس لوگ یادِ خدا میں مصروف تھے۔ میں بادلِ ناخواستہ بصد حسرت وہاں سے جدا ہُوا۔ میرے قریباً سارے ہی دوست جو شہر کے مختلف حصّوں میں رہتے تھے۔ مجھے الوداع کہنے کو پہنچے اور رات کے اندھیرے میں قریباً ایک میل دور تک میرے ساتھ آخری باتیں کرتے چلے گئے۔

میرا دل آج بھی جبکہ میں اُس گھڑی کی یاد میں ہوں رنج و درد سے بھرا ہُوا ہے۔ اس واقعہ کو پورے چالیس برس (شمسی حساب سے) گزر چکے ہیں۔ مگر آج میں یوں محسوس کرتا ہوں۔ کہ وہ دن آج پھر لوٹ آیا ہے۔ اُس درد کی کہانی اور مفارقت کا قصّہ بیان کرنے کی مجھ میں تاب نہیں۔ اُسے چھوڑتا ہوں۔

چونیاں کی تعلیم کے زمانہ میں چند ماہ کا وقفہ بھی ہو گیا تھا۔ جس کی تاریخ اور سنہ کا مجھے صحیح طور سے علم نہیں۔ یوں ہوُا۔ کہ میرے والد صاحب کی تبدیلی تحصیل قصور کے بعض دیہات میں ہو گئی۔ ان میں سے ایک کا نام غالباً دو بُرجی تھا۔ وہاں اکثر ڈوگر لوگ رہتے تھے۔ اس زمانہ میں چند ماہ کے لئے چونیاں سے مجھے قصور کے سکول میں داخل کرا دیا گیا تھا۔ مگر یہ صرف چند ماہ کا زمانہ تھا۔ جس کی وجہ سے مجھے کوئی خاص بات یاد نہیں۔

سکول کی طرف سے مجھے لوکل و ڈسٹرکٹ ٹورنامنٹ میں بھی حصّہ لینے کے مواقع آئے جن میں سے بعض میں نمایاں طور سے مجھے کامیابی ہوُا کی۔ اور عموماً سب سے زیادہ انعامات پانے کا موقع ملا۔ جس کی وجہ سے میرا نام

سکول کی ہرفسٹ ٹیم میں ہوتا تھا۔

اِن حالات کے تحریر کرنے میں بعض ضمنی اور چھوٹے چھوٹے واقعات میں نے نظر انداز بھی کر دیئے ہیں۔ اور رؤیا اور خواب کا معاملہ صرف میری ذات سے تعلق رکھتا ہے لہٰذا اس حصّہ کو بھی میں نے حذف ہی کئے رکھنے کا خیال رکھا ہے۔ ورنہ بعض خوابیں مجھے بچپن ہی سے جبکہ میرا سینہ نورِ اسلام سے منور ہو چکا تھا۔ ایسی صاف اور واضح آیا کرتی تھیں۔ کہ اُن میں سے بعض بہت جلد اور بعض کچھ دن بعد ہوبہو پوری ہو کر میری ترقیٔ ایمان و ایقان کا باعث ہوُا کرتی تھیں۔ مگر مجھے ان پر کبھی بھی فخر نہیں ہوُا۔ بلکہ ہر ایسی حالت کو میں نے چھپانے کی کوشش کی۔ اور خدا کا محض فضل یقین کرتے ہوئے شکر گذاری میں بڑھتا گیا۔

میرے والد صاحب پُرانے زمانہ کی تعلیم کے زیور سے مزیّن تھے۔ اور لائق فارسی دان قابل منشی اور خوشخط و خوشنویس تھے۔ ان کی تعلیم فارسی بھی چونکہ مسلمان اساتذہ ہی کے ذریعہ ہوئی تھی۔ لہٰذا ان کے خیالات میں بھی کبھی کبھی اِسلامی جھلک نظر آجایا کرتی۔ اور ایک حد تک والد صاحب کے خیالات بھی اس راہ میں میرے خضر راہ ہوئے۔

یہ لکھنا مجھ سے رہ گیا ہے۔ کہ میری شادی بچپن ہی میں والدین نے کر دی تھی۔ جبکہ ہم لوگ دیر سنگھ والا میں رہتے تھے۔ اور میں دوسری یا تیسری جماعت میں چونیاں تعلیم پاتا تھا۔ شادی قومی رسوم و رواج کے مطابق ویرم دِتّاں تحصیل شکر گڑھ ضلع گورداسپور کے ایک دت گھرانہ میں ہوئی۔ میرے خسر صاحب کا نام چوہدری دیویدتہ مل جو اچھے زمیندار اور آسودہ حال آدمی تھے۔

یہ امر بھی مجھ سے لکھنا رہ گیا ہے۔ کہ باوجودیکہ اس زمانہ میں (۱۸۹۳ء و ۱۸۹۴ء) سیّدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا جابجا چرچہ تھا۔ مگر چونیاں کے مسلمان کچھ ایسی حالتِ جمود و سکوت میں تھے۔ کہ کم از کم میرے کان میں اُس زمانہ میں حضور پُرنور کا ذکر نہ پہنچا۔ البتہ ایک بات مجھے یاد ہے۔ کہ میرے کان میں پڑی تھی۔ جسے میں بعد میں قادیان پہنچ کر بلکہ اُس سے پہلے سیالکوٹ میں سمجھا۔ وہ یہ تھی کہ ایک لڑکے نے جو کسی تقریب پر لاہور وغیرہ گیا تھا۔ واپسی پر مجھ سے ذکر کیا۔ کہ اس سفر میں ایک عجیب بات سننے میں آئی ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ

"ایک مسلمان مولوی نے جو بڑا عالم ہے۔ ایک انگریز کی موت کی پیشگوئی کی۔ اور وہ پوری ہوگئی۔"

اور میرے سوال پر بتایا۔ کہ

"وہ شخص دور کہیں روس کی سرحد پر رہتا ہے۔ گاؤں کا نام سنا تو تھا۔ مگر یاد نہیں رہا۔"

قریبًا دو دن رات کے سفر کے بعد ہم لوگ نہر کے اُس بنگلہ پر پہنچے جس کو اُس زمانہ میں پکّے ماڑی یا پکّی ماڑی کا بنگلہ کہتے تھے۔ اور وہاں سوائے چند کوٹھیوں اور بنگلوں کے کوئی آبادی نہ تھی۔ البتہ زمیندار لوگ بعض بعض جگہ جھونپڑیاں ڈالے پڑے تھے۔ جن میں سکھ بھی تھے اور مسلمان بھی۔

اوّل اوّل تو میں گھر کی چاردیواری کے اندر ہی رہتا اور کسی سے بات تک کرنے کا روادار نہ تھا۔ البتہ ایک خوبصورت جلد اور موزوں تقطیع کی نہائت ہی خوشخط لکھائی اور عمدہ چھپائی کی کتاب مجھے دفتر کے کمرہ سے مل گئی۔ ان اُداسی کی گھڑیوں میں وہ میری دلبستگی اور تنہائی میں میری رفاقت کا حق ادا کرتی رہی۔ اور میں نے اس کو ایک مرتبہ نہیں دو تین مرتبہ ختم کیا۔ اس کتاب کا نام تھا "انجیل مقدس"

اِس کے مطالعہ سے مجھ پر کیا اثر ہوُا؟ میں آجتک بھی حیران ہوں۔ کہ ایسی اُداسی تنہائی اور انہماک کے باوجود اِس کتاب کے بار بار مطالعہ کا میرے خیالات پر کچھ بھی اثر نہ پڑا۔ اور جو رنگ میری طبیعت پر اللہ تعالےٰ نے چڑھا رکھا تھا۔ وہ پھیکا پڑا نہ کمزور ہوُا۔

آخر ایک روز میرے والد صاحب نے مجھے ایک خط لاکر دیا۔ جو کھُلا تھا۔ مگر چونکہ انگریزی الفاظ میں تھا۔ والد صاحب اُس کو پڑھ سکے نہ مطلب سمجھ سکے۔ میں وہ خط لیکر بہت خوش ہوُا۔ اور نہر کے اُس پار جنگل میں چلا گیا۔ جہاں اسکو بار بار پڑھا۔ اور پھر اس کا وہیں بیٹھ کر جواب لکھ کر ڈاک میں ڈال دیا۔ وہ میرے ایک رفیق کا خط تھا۔ جس نے چونیاں سے حسب وعدہ اپنے اور دوسرے دوستوں کے حالات لکھ کر بھیجے تھے۔ اور مجھے میرے خیالات پر پختہ رہنے کی تلقین تھی۔ اُن کا نام نامی اور اسم گرامی تھا سیّد بشیر حیدر۔

عجیب بات ہے۔ جب تک میں ان دوستوں کے درمیان تھا۔ ہر وقت اُن کے ساتھ ملکر رہتا تھا۔ اُس زمانے میں تو شاذ ہی کسی نے کبھی مجھے کوئی بھلی بات کہی ہوگی۔ جو اپنے اندر تبلیغی رنگ رکھتی ہو۔ مگر میرا اُن سے جُدا ہونا تھا۔ کہ دوستوں کے دلوں میں ایک جوش تبلیغ پیدا ہو گیا۔ اور عمومًا ہر خط میں جو مجھے ملتا تھا۔ کسی نہ کسی رنگ میں علی قدر مراتب مجھے اسلامی خیالات کی تلقین ہوُا کرتی تھی۔ قاضی فضل الحق صاحب، سیّد امداد علی شاہ صاحب و سیّد جعفر علی شاہ صاحبان پیر جہانیاں والے سیّد زین العابدین شاہ صاحب اور ان سب میں سے پیش پیش رہنے والے میرے بہت ہی پیارے اور محسن دوست سیّد بشیر حیدر صاحب تھے۔

میں بھی اُن خطوط کا مناسب جواب دیتا رہتا۔ اور اس طرح یہ سلسلہ خط و کتابت اتنا بڑھا۔ کہ میرے والد صاحب کو ناگوار معلوم ہونے لگا۔ اور آخر انہوں نے مجھے اس سے روک دیا۔ اور بعض کو میرے ذریعہ اور بعض کو خود لکھ کر منع کر دیا۔ کہ وہ خطوط نہ لکھیں۔ میری بیتابیٔ دل اور بیقراری کا زمانہ پھر شروع ہو گیا۔ اور خط و کتابت بند ہوتے ہی میری طبیعت پھر جنگلوں اور بیابانوں کی طرف دوڑنے لگی۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی۔ کہ میں اکثر دن بھر جنگل اور بنوں میں دیوانہ وار پکارا کرتا پھرتا۔ اور صرف رات گذارنے یا والدین کو حاضری دینے کی خاطر رات کو گھر آجاتا۔

لائل پور آجکل جہاں آباد ہے۔ اس جگہ اور اس سے جانب جنوب بالکل جنگل ہی جنگل تھا۔ اور اتنے بڑے بڑے پیلو (وَن) کے درخت تھے۔ کہ بعض کے نیچے پورا قافلہ ٹھہر سکتا یا سو پچاس بھینس بیٹھ سکتی۔ اُن درختوں کے گھن دار سایہ تلے بیٹھا دعائیں کیا کرتا یا بعض اشعار پڑھتا رہتا ؎

دلا غافل نہ ہو یکدم یہ دنیا چھوڑ جانا ہے

یہ پوری نظم مجھے یاد تھی۔ یا بعض اشعار اس زمانہ کے کورس کے یاد تھے۔ جن میں درد سوز اور گداز ہوتا اکثر پڑھتا رہتا۔

اس حالت میں قریبًا مہینہ ڈیڑھ گذرا ہوگا۔ کہ والد صاحب کو کسی نے میرے حال کی اطلاع دیدی۔ جس کے نتیجہ میں والد صاحب نے اس خیال سے کہ بیکاری اور تنہائی کی وجہ سے یہ باتیں پیدا ہوئی ہونگی۔ مجھے میرے چچا چوہدری جیون مل صاحب (رشتہ میں تھے۔ حقیقی چچا کوئی نہ تھے۔ بلکہ دو حقیقی چچا آیا یعنی میرے والد صاحب کے بڑے بھائی تھے جسے پنجابی میں تایا کر کے پکارتے ہیں) اوسیر کے پاس بھیج دیا۔ کہ میں وہاں جا کر نقشہ نویسی یا لیول وغیرہ کا کام سیکھوں۔ میرے چچا چوہدری جیون مل صاحب ایسے علاقہ کی پیمائش کر رہے تھے۔ جہاں ابھی آبادی کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ کوئی بنگلہ تھا نہ کوٹھی بلکہ سراسر سنسان جنگل اور بے پایان ویرانہ چلا جاتا تھا۔ آبادی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ چنانچہ یہ علاقہ میری طبیعت کے لحاظ سے نہائت ہی موزوں اور مناسب ثابت ہوُا۔ اور میں پہلے سے زیادہ اور بالکل آزادانہ طور پر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

شروع شروع میں مہمانی کے خیال سے مجھے میری مرضی پر چھوڑے رکھا گیا۔ اور میں جدھر چاہتا نکل جاتا جب چاہتا واپس آجاتا۔ کوئی دیکھتا نہ پوچھتا۔ کہ میں کس حال میں رہتا ہوں۔ اور اس طرح اللہ تعالےٰ نے اس تنہائی، فرصت اور ویرانے کو میرے دل کی آبادی اور مضبوطی کا ذریعہ بنا دیا۔ میں اگر سارا سارا دن بھی اللہ کے حضور رونے اور گڑگڑانے میں گزار دیتا۔ تو کوئی دیکھنے سننے والا تھا نہ روکنے والا۔ مگر یہ فرصت زیادہ لمبی نہ ہوئی۔ اور یہ نعمت یوں مجھ سے واپس لے لی گئی کہ میرے اِدھر بھیجنے کے جلد ہی بعد میرے والد صاحب کی تبدیلی ہو گئی۔ اور وہ بجائے پکّے ماڑی کے اب چکوٹ سے تین میل کے فاصلہ پر غالبًا چک نمبر ۶۲ کے حلقہ میں آ گئے۔ اور یہ غالبًا ماہ مئی ۱۸۹۵ء کا زمانہ تھا۔

کام جس کے سیکھنے کے خیال سے مجھے بھیجا گیا تھا ابھی تک میں نے اچھی طرح شروع بھی نہ کیا تھا۔ کہ

نئے حلقہ میں تبدیل ہو کر آنے پر والد صاحب نے مجھے ملنے کی غرض سے بلوا بھیجا۔

مجھے جب سے والد صاحب نے دوستوں سے سلسلۂ خط و کتابت بند کر دینے کا حکم دیا بہت صدمہ تھا۔ اور میں اکثر سوچتا رہتا تھا۔ کہ کس راہ سے ان پابندیوں کو توڑوں۔ کبھی سکول میں تعلیم کی غرض سے داخل کرا دینے کے لئے عرض کرتا۔ اور جب اس کا نفی میں جواب ملتا۔ تو میں یہی عرض کر دیتا۔ کہ مجھے ملازمت ہی کہیں دلا دیں۔ تاکہ میں بیکار نہ رہوں۔ مگر یہ کہکر انکار کر دیا جاتا۔ کہ ہمیں نوکریوں کی ضرورت نہیں۔ ہم اوروں کو نوکر رکھ سکتے ہیں تو دوسروں کی نوکری کیوں کریں۔

اس زمانہ میں نہر کی پٹوار کیا تھی تخت شاہی تھا۔ لائل پور کی بار۔ نئی زمین۔ بڑے بڑے زمیندار، پیداوار اور آمد کی کوئی انتہا تھی نہ حساب۔ ادھر نہر کے پٹواری گویا نہر کے مالک ہوتے تھے۔ جو چاہتے تھے کرتے تھے۔ نئے کام کی وجہ سے انتظام مکمل تھے نہ ہو گئے قائم۔ غرض اس طرح پٹواریوں کے جہاں اختیارات بہت وسیع تھے۔ وہاں انکی آمدنی کی بھی کوئی حد بست نہ تھی۔ اور انہی خیالات کے ماتحت مجھے یہ جواب دیا جایا کرتا تھا۔ کہ ہمیں نوکریوں کی ضرورت نہیں۔ ہم خود نوکر رکھ سکتے ہیں۔ وغیرہ

سکول لائف میں ایک اچھا کھلاڑی تھا۔ اور میرے کھیل کا عام چرچہ بھی تھا۔ ٹورنامنٹوں میں بھاری انعامات بھی حاصل کیا کرتا تھا۔ جس کی وجہ سے میرے والدین کو بھی یہ علم تھا۔ کہ میں اس فن میں ماہر ہوں۔ لہذا میں اکثر والدہ سے ایسے طریق سے بات کیا کرتا کہ مجھے جمناسٹک ماسٹری پر ملازم کرا دیں۔ جس کے لئے اُن کو کوشش کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔ میں خود ہی اس کے حصول کا انتظام کر لوں گا۔ مگر ہمیشہ مجھے جواب نفی ہی میں ملا کرتا۔

آخر میں والد صاحب کی تبدیلی کے بعد والدین اور بھائی بہنوں کی ملاقات کو چک نمبر ۶۲ پہنچا۔ اور چونکہ تین چار ہفتہ کی غیبوبت کے بعد گھر گیا تھا۔ ذکر اذکار میں اس مرتبہ بھی میں نے وہی عرض کیا۔ کہ مجھے جمناسٹک ماسٹری کی جگہ ملتی ہے۔ اور کہ مجھے فلاں جگہ سے خط بھی آیا تھا۔ آپ اجازت دیں تو چلا جاؤں۔ مگر جواب اب بھی وہی تھا جو ہمیشہ پہلے ملا کرتا تھا۔

خدا کی شان مجھے وہاں آئے ابھی چند ہی روز ہوئے تھے۔ کہ میرے مخلص اور للّٰہی دوست مکرم سید بشیر حیدر صاحب کی طرف سے پھر ایک ملفوف مجھے ملا جو مصلحت الٰہی سے میرے والد صاحب کے علم میں نہ آیا۔ وہ یوں ہوا۔ کہ ایڈریس تو وہی پہلی جگہ کا تھا۔ مگر وہاں سے ری ایڈریس ہو کر نئی جگہ آ گیا۔ اور پوسٹ مین جو ہفتہ وار دورہ پر آیا ساتھ لیتا آیا۔ اس وقت مکرم والد صاحب گھر پر نہ تھے۔ اور اس طرح وہ لفافہ براہ راست مجھی کو ملا۔

اس لفافہ میں کیا لکھا تھا۔ مجھ پر اس کا کیا اثر ہوا۔

یہ ایک نہائت ہی دردناک قصّہ اور داستانِ غم ہے جس سے میری زندگی کا بالکل ہی نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اور وہ اتنا طویل ہے۔ کہ آج اس کے لکھنے کا وقت نہیں۔ انشاءاللہ تعالےٰ بشرط توفیق پھر سہی۔

سیّد بشیر حیدر صاحب ایک ایسے انسان تھے۔ کہ اُن کی خوبیوں کا گننا بھی میرے لئے مشکل ہے۔ اُن کو میرے ساتھ گویا فطری لگاؤ تھا۔ اور ایسی پاک محبت تھی جس کی اس عمر کے نوجوانوں میں بہت کم نظیر ملتی ہے وہ سادات خاندان کے ایک شریف ڈاکٹر کی اولاد اور معزز گھرانے کے ممبر ہونے کے لحاظ سے چونیاں کی ممتاز ہستیوں میں شمار ہوتے تھے۔ مگر باوجود اس کے اُن کو مجھ سے ایسی محبت اور اتنا گہرا تعلق تھا۔ کہ سکول میں ہمیشہ میرے پہلو بہ پہلو بیٹھتے یا کم از کم یہ کوشش ضرور کرتے۔ کہ میرے بنچ پر بیٹھیں۔

وہ تعلیم میں ہوشیار اور لائق تھے۔ اور میں بعض مضامین میں کمزور تھا۔ میری خاطر مجھے سکول کے مضامین کی تیاری کرانے کی غرض سے میرے گھر یا میری بیٹھک پر تشریف لاتے۔ اور اپنا قیمتی وقت میرے لئے قربان کیا کرتے تھے۔

باوجود ان باتوں کے وہ ہمیشہ میرا ادب اور احترام بھی کرتے۔ اور مجھ سے بہت حیا کرتے تھے۔ گو اکٹھے رہنے کے زمانہ میں انہوں نے مجھے کبھی تبلیغ نہ کی۔ بلکہ الٹا میں ہی اُن کے لئے روزے وغیرہ رکھ کر اُن کو تبلیغ کیا کرتا تھا۔ مگر جدائی کے بعد انہوں نے روحانی رنگ میں میری بہت مدد کی اور میں کہ سکتا ہوں۔ کہ میرے اظہار اسلام میں اُن کا بہت بڑا حصّہ دخل تھا۔ جزاہم اللہ احسن الجزاء

مئی ۱۸۹۵ء کی تیئس تاریخ تھی جب وہ ملفوف مجھے ملا۔ گو لفافہ کے ایڈریس ہی سے مجھے معلوم ہو گیا تھا۔ کہ وہ سیّد بشیر حیدر صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہے۔ مگر مزید اطمینان کے لئے میں نے لفافہ جلدی سے کھولا اور پھر بغیر پڑھے اور مضمون سے واقف ہوئے فوراً ہی بند کر کے جیب میں ڈال لیا۔ اس خیال سے کہ مبادا والد صاحب تشریف لے آئیں۔ ان کو علم ہو جائے۔ تو پھر وہ خفا ہونگے۔ کیونکہ ان کے کھانے کا وقت قریب تھا۔ اور وہ گرداوری سے واپس آنے ہی والے تھے۔

میں قلم دوات اور کاغذ لیکر گھر سے باہر ہیک کھال کے کنارے گھنے سایہ دار درختوں تلے چلا گیا۔ جہاں مجھے خیال تھا۔ کہ اس وقت کوئی نہ آئیگا۔ مدت کے بعد خط آنے کی وجہ سے یا خط کے مضمون اور اس کے اثرات کے باعث میرے دل پر غیر معمولی دھڑکن اور سارے جسم پر لرزہ تھا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں مگر شوق بھرے دل سے میں نے خط کھول کر پڑھنا شروع کیا جس کا ایک ایک فقرہ بلکہ ایک ایک لفظ میرے دل میں بیٹھتا گیا۔ اور میرا دل بے قابو ہوتا چلا گیا۔

ابتداء میں چند جملے خط و کتابت کی روک کے متعلق بطور شکوہ و شکایت رواجی خیر و عافیت اور پرسش احوال پر مشتمل تھے۔ اور اس کے بعد چند اشعار تھے جن میں انوار و برکاتِ اسلام کے ذکر کے ساتھ ہی تبلیغِ اسلام تھی۔ پوری نظم تو مجھے یاد نہ رہی۔ البتہ ایک مصرعہ اس نظم کا کچھ ایسا دل میں سمایا۔ کہ آج تک یاد سے اترتا ہی نہیں۔ جو یہ تھا ؎

……… لے پکڑ دامن رسول کا

میں نہیں کہ سکتا۔ کہ اس نظم کہنے والے کے دل کا درد سوز یا گداز تھا جس نے مجھے ایسا درد مند کیا۔ اور مجھ میں ایسا سوز پیدا کر دیا۔ جس سے میں اتنا رویا، اتنا رویا۔ کہ اس کا بیان بھی ناممکن ہے۔ یا وہ نظم لکھ کر بھیجنے والے کے اپنے دل کی کیفیت تھی جس نے مجھے اتنا رُلایا کہ اتنا رونا اس کے بعد مجھے صرف دو ہی یا تین مرتبہ یاد ہے۔

میں پھوٹ پھوٹ کر رو لیتا۔ اور پھر خط کو اٹھا کر پڑھنا شروع کر دیتا تھا جس کے بعد پھر وہی رقّت قلب پر طاری ہو جاتی۔ اور میں دل کھول کر جی کی بھڑاس نکال لیتا۔ چنانچہ اسی طرح چند مرتبہ میں نے اس نظم کو دہرایا اور چونکہ وقت زیادہ گزر گیا تھا۔ قلم اٹھا کر بے ساختہ خط کا جواب لکھنا شروع کر دیا۔ لکھتے لکھتے ایک مقام پر پھر قلب کی وہی کیفیت ہو گئی۔ اور چند منٹ تک قلم رکا رہا۔ وہ وقفہ کیسا تھا۔ اور کیوں تھا؛ اس کا پورا جواب تو ناممکن ہے۔ کیونکہ نہ وہ وقت اب واپس آ سکتا ہے۔ اور نہ ہی وہ کیفیت قلم لکھ سکتا ہے۔ نہائت ہی مجمل سا بیان یہ ہے۔ کہ میں اس آواز کے جواب میں جو مجھے خدا کے نام پر دی گئی تھی لبیک کہنا چاہتا تھا۔ مگر دل اس کٹھن گھاٹی کے مشکلات کا خیال کر کے کانپنے اور لرزہ کھانے لگتا۔ اور ہاتھ رُک جاتا تھا۔ اور یہ ایک ایسی کشمکش اور گرداب تھا۔ کہ جس میں سے میں اپنی طاقت اور سمجھ یا قوّتِ بازو سے نکل سکنے کے قابل نہ تھا۔

آخر میں پھر رو دیا اور گڑگڑایا۔ اور خدا سے امداد کا طالب اور راہنمائی کا ملتجی ہوا جس کے نتیجہ میں خدا نے محض اپنے فضل سے میرے دل کو سکون اور اطمینان اور ہاتھ کو قوت بخشی اور میں نے غیر مشروط الفاظ میں مکرم سیّد بشیر حیدر صاحب کی خدمت میں اُن کے خط کے جواب میں لکھ دیا۔ کہ

> "میں پندرہ روز کے اندر آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔ اس میں تخلف ہرگز نہ ہوگا۔ اور اگر میں اس عرصہ میں نہ پہنچوں۔ تو آپ یقین کر لینا۔ کہ ہرشیچندر دنیا کے پردے پر زندہ موجود نہیں" بس۔ والسلام

میں نے یہ لکھا اور اس قوت اور اطمینان سے لکھا۔ کہ میرے دل میں کسی قسم کا شک پیدا ہوا نہ گھبراہٹ نہ خوف بلکہ ایک تسکین تھی جو خدا کی طرف سے نازل ہوئی جس سے گویا میرے دل پر سے بوجھ کے پہاڑ اُتر گئے اور میں ہلکا پھلکا ہو گیا۔

میں نہ جانتا تھا۔ کہ "پندرہ روز" کا وعدہ میں نے کس اُمید اور خیال پر کیا ہے اور نہ ہی میرے دل میں

کوئی سکیم اور پروگرام تھا جس کا نقشہ میں نے دل میں مرتب کر لیا تھا۔ وہ محض ایک فقرہ تھا۔ جو بے ساختہ لکھا گیا۔ اور ایک جملہ تھا جس کی تفصیل وکیفیت اس وقت میرے ذہن میں ہرگز ہرگز نہ تھی۔ کیونکہ میں نے سوچ سمجھ کر نہ لکھا تھا۔ اور خود بھی نہ لکھا تھا۔ بلکہ وہ مجھ سے لکھوا دیا گیا تھا۔

الغرض خط کا جواب لکھا گیا جسے لفافہ میں بند کر کے گاؤں کو لوٹا۔ ڈاک کے ہرکارہ کی تلاش کی۔ اور وہ لفافہ چند پیسے انعام کے ساتھ اس کے حوالے کر کے فارغ ہوا۔

خط ہرکارے کو دیکر اور پھر اس کے بعد بھی میں مطمئن تھا۔ خوش تھا۔ اور کوئی گھبراہٹ میرے دل میں نہ تھی کہ کیوں میں نے ایسا کام کیا جس کا پورا کرنا میری طاقت میں نہیں۔ اور جس کے عدم ایفاء کا نتیجہ موت ہے۔ دل میں یہی تھا۔ کہ جو ہوا ٹھیک ہوا۔ اور ہونا تھا جو ہو گیا۔ اب ڈر اور خوف کی گنجائش ہی باقی نہیں۔

خط تھا۔ لکھا بھی گیا۔ اور چلا بھی گیا۔ مگر اس میں مندرجہ وعدہ کے ایفاء کا کوئی سامان...... محض ایک وہم اور جنون تھا۔ نہ صرف یہی تھا۔ کہ سامان کوئی نہ تھا۔ بلکہ اس کی مخالفت خود میرے والدین فرما رہے تھے۔ اور اپنی ساری توجہ اور پورا زور اس بات پر خرچ کر رہے تھے۔ کہ کسی طرح میرے دل سے باہر جانے کے خیال کو بالکل ہی نکال دیں۔ چنانچہ کبھی کبھی میں نے بیکاری کا شکوہ کر کے عرض کی۔ تو مجھے کبھی محبت، اور نرمی سے اور کبھی ناراضگی اور خفگی سے یہی جواب ملا کہ یہ خیال دل سے نکال دو۔ ہمیں نوکری کی ضرورت نہیں گھر میں پرماتما نے بہت کچھ دے رکھا ہے اس کو سنبھالو۔ اور بھائی بہنوں کے ساتھ ملکر خوشی سے کھاؤ پیو۔ اور اگر کام کا بہت ہی شوق ہے۔ تو ہمارے کام میں ہماری مدد کرو۔ وغیرہ

میں والد صاحب کے کام میں مدد بھی کیا کرتا۔ گرداوری اور پیمائش یا گشت وغیرہ کر آتا تھا۔ مگر بعض باتوں میں میں ان کے خیال کے مطابق ان کا نقصان بھی کیا کرتا تھا۔ جس سے وہ کبھی کبھی کبیدہ خاطر ہو کر فرمایا کرتے۔ کہ "اس لڑکے کو گھر کے نفع نقصان کی بھی سمجھ نہیں۔" اور یہ شکایت یوں پیدا ہوتی تھی۔ کہ میں تو خیر کسی کو پکڑتا ہی نہ کرتا۔ مگر بعض اوقات ایسا بھی ہوتا۔ کہ والد صاحب گشت میں جاتے۔ تو لوگوں کے مویشی وغیرہ گھیر کر لے آتے۔ اُن سے بھاری رقم جرمانہ وغیرہ وصول کیا کرتے تھے۔ مجھے موقعہ لگ جاتا تو میں کسی نہ کسی طرح والد صاحب کو ٹالنے کی کوشش کرتا۔ یا اگر والد صاحب انہیں چھوڑ کر ادھر اُدھر ہوتے۔ تو اُن کو چھوڑ یا بھگا دیا کرتا تھا۔ کیونکہ میں ان باتوں کو اکثر حالات میں ظلم اور زیادتی کی حد تک بڑھا ہوا پاتا تھا۔

دن ایک ایک کر کے گذرنا شروع ہوئے۔ اور جوں جوں وہ گذرتے میری بیقراری اور اضطراب بڑھتا جاتا۔ اور بے چینی سے کبھی صحن میں کبھی چھت پر اور کبھی انگنائی کی چاردیواری میں بیٹھا پُرسوز اور رقت آمیز لہجہ میں بعض دردناک فقرے بولا کرتا۔ یا دہی "دلا غافل نہ ہو یکدم کہ دنیا چھوڑ جانا ہے"۔ کی صدائیں کرتا رہتا۔

آنیوالی خیالی مصیبت کے خیال کا دل پر گہرا اثر تھا۔ جس کی وجہ سے خوشی آہستہ آہستہ دل سے نکلتی جا رہی تھی اور اس کی بجائے غم والم اور اُداسی و افسردگی جگہ لے رہے تھے مجھے کھانے سے رغبت رہی۔ نہ پینے کا شوق باقی رہا۔ گھر میں دودھ دہی کی افراط تھی جس کا میں بچپن سے شوقین تھا۔ مگر اب باوجود والدہ صاحبہ کے تقاضا کے میں نہ پیتا۔ مرغ میں نے بکثرت جمع کر رکھے تھے۔ اُن کی داشت سنبھال کا بھی قصہ چک گیا۔ اور کتے بلی کا وہ شکار ہونے لگے۔ رات کو مجھے چین نہ آتا اور کروٹ لیتے یا ستارے گنتے کٹنے لگی۔ اور ان باتوں کا اثر میری جسمانی صحت پر بھی پڑنے لگا۔ اور میرے دلی درد کی ترجمانی میرا چہرہ اور باقی اعضاء کرنے لگ گئے۔

والدہ محترمہ چونکہ گھر میں ہوتیں۔ میری حرکات اور بیقراری و بے تابی کا معائنہ فرمایا کرتیں۔ اور چونکہ وہ عورت ذات تھیں۔ اُن کا دل فطرتاً نرم تھا۔ میرے ان حالات کا ان کے دل پر اثر ہوتا۔ اور کبھی کبھی وہ والد صاحب کو میرے متعلق فرمایا کرتیں

"اسے کیا ہو گیا ہے۔ یہ تو دن بدن کمزور ہوتا جاتا ہے کھاتا ہے نہ پیتا ہے۔ بلکہ دن رات رو رو کر کچھ پڑھتا رہتا ہے۔ اسے جہاں کہتا ہے کیوں نہ بھیجدیں۔"

مگر والد صاحب توجہ نہ فرماتے۔ اور بات کو ٹال دیا کرتے۔ ہوتے ہوتے ایک ہفتہ گذر گیا۔ آٹھ۔ نو۔ دس۔ گیارہ بارہ بلکہ تیرہ دن گذر گئے۔ مگر میری مشکلکشائی کا کوئی سامان نظر نہ آیا۔ دن چڑھا مگر میرا دل بیٹھا ہوا تھا۔ گھر والوں نے ناشتہ کیا۔ اور کھایا پکایا۔ مگر مجھے ان چیزوں سے نفرت تھی۔ کیونکہ آجکا دن میرے وعدہ پر پہنچ سکنے کا آخری دن تھا۔ زمین و آسمان میرے واسطے اندھیر تھے۔ اور اب مجھے دنیا کی کسی چیز سے وابستگی باقی نہ رہی تھی۔

میں آج کسی خاص خیال سے بالکل ہی نرالے رنگ کے گیت گایا کیا۔ جن کو میرے سوا یا میرے خدا کے بغیر کوئی سمجھ بھی نہ سکتا تھا۔ اور آج میں اپنے خیال میں اپنے خدا سے بھی آخری ہی عرض معروض کر رہا تھا۔ دن چڑھا۔ دوپہر ہوئی۔ دن ڈھلا اور پھر شام ہوئی۔ اور شام کے ساتھ ہی مجھے اپنی زندگی کی بھی شام نظر آنے لگی۔ اور مجھ پر انتہائی اضطراب بے قراری اور بے چینی مسلط ہو گئی۔ اور ایسا ہوا۔ کہ مایوسی کا غلبہ ہو گیا۔ اور میں سر شام ہی چھت پر جا کر لیٹ گیا۔

مجھے لیٹے ابھی چند ہی منٹ ہوئے ہونگے۔ کہ میرے کان میں والد صاحب کی آواز پڑی جن کے ساتھ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کوئی اجنبی گھوڑا گھوڑی ہے۔ والد صاحب نے گھوڑی کو باہر چھوڑا۔ اور اندر تشریف لائے۔ والدہ صاحبہ نے اس گھوڑی کے متعلق پوچھا کس کی ہے۔ اور کیوں آئی ہے؟ میں بیٹھے بھی کان لگا کر والدین کی باتوں کو سننے کی کوشش کی۔ اور میری خوشی کی کوئی انتہا باقی نہ رہی۔ جب میرے کان میں یہ آواز پڑی کہ گھوڑی لایا ہوں۔

"تمہارے پوٹھے کو نوکری کے واسطے بھیجنے کی غرض سے اور بردالا بھی بلوایا ہے۔ اس کے واسطے روٹی وٹی پکاؤ۔ رات ہی کو بھیجدیں۔ کیونکہ گرمی کا موسم ہے۔ دن میں سفر نہ ہو سکیگا۔ راستہ میں پانی بھی نہیں ملتا۔ وغیرہ"

میں یہ خبر سنکر اچھل پڑا۔ نیچے اتر آیا۔ اور تجاہل عارفانہ کے طریق پر والد صاحب سے گھوڑی کے متعلق پوچھنے لگا۔ جس کے جواب میں والد صاحب نے مجھے بھی وہی کچھ فرمایا۔ جو والدہ صاحبہ سے کہا تھا۔ اور فرمایا۔ کہ ایک دو جوڑے کپڑوں کے اور مختصر سا بستر ساتھ لے لینا۔ کیونکہ گھوڑی پر زیادہ بوجھ نبدھ نہ سکے گا۔

قربان جاؤں میں اپنے قادر مطلق خدا کے جو حقیقۃً مقلب القلوب اور نہاں در نہاں خیالات پر بھی تصرف رکھتا ہے۔ اور جس کے اذن کے بغیر کوئی ذرہ بھی حرکت نہیں کر سکتا اور سچ سچ وہی پاک ذات کُن فیکون کا مالک ہے۔ مایوسی اور ناامیدی میں وہ بے سہاروں کا سہارا اور ناامیدوں کی امید بنتا۔ اور مضطر کی التجا کو سنتا اور غیر ممکن کو ممکن میں بدل دیتا ہے۔

میرے وہم میں بھی کوئی بات نہیں آ سکتی۔ اور ڈھونڈ کر بھی میں وہ اسباب نہیں معلوم کر سکتا۔ جن کے نتیجہ میں میرے والد صاحب کے دل پر ایسا تصرف ہوا۔ کہ کل تک جس بات سے وہ باوجود درخواستوں کے انکار اور انکار پر اصرار کرتے تھے۔ آج کس وجہ سے خود بخود اس کے لئے سامان کر لائے۔ کس چیز نے اُن کے دل کو پھیرا؟ وہ صرف اور صرف خدائے واحد و یگانہ کی قدرت کا ایک کرشمہ تھا۔ ورنہ اور کوئی سامان اس کے لئے ہرگز ہرگز موجود نہ تھے والدہ محترمہ نے جلد جلد کچھ میٹھی روٹیاں۔ حلوہ اور مانڈے تیار کئے اور میں جو پہلے ہی کمربستہ تھا۔ جلدی جلدی کپڑے سمیٹ بستر باندھ تیار ہو گیا۔ بردالے کے آنے میں کچھ دیر ہوئی۔ اتنے میں میں اپنے بھائی بہنوں کو ایک ایک کر کے گلے لگا کر پیار کرنے لگا۔ اور ایسا ہوا۔ کہ میرا دل اُن خیالات کی وجہ سے جو میرے دل میں موجزن تھے بھر گیا۔ جدائی بلکہ دائمی جدائی کے خیال سے میں ایسا متاثر ہوا۔ کہ ضبط نہ کر سکا۔ اور باوجود اس خطرہ کے کہ اسوقت کی بے صبری نہ معلوم کیا بنا دیگی۔ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ اور گھر میں ایسا کہرام مچا۔ کہ گاؤں والے گھبرا کر خیریت پوچھنے کو دوڑے بردالے نے آواز دی۔ اور میں دل کو تھام کر روتے ہوئے بھائی بہنوں اور غمگین ماں باپ کو خدا کے لئے گویا ہمیشہ کے واسطے چھوڑ کر گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ تھوڑی دور تک جا کر والد صاحب اور چھوٹے بھائی نے الوداع کہی وہ واپس لوٹے اور میں جلد جلد اپنا سفر کاٹنے لگا۔ چلتے چلاتے رات کے بارہ بج چکے ہونگے اور یہ رات پانچ اور چھ جون ۱۸۹۵ء کی درمیانی رات تھی۔ جب میں گھر سے خدا کی رضا اور اس کے دین کی تلاش میں نکلا۔ اور سات جون کا دن وہ آخری دن تھا۔ جس کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے میری قلم سے میرے ایک حقیقی دوست کے نام لکھوایا ہوا تھا۔

میں جس گھوڑی پر سوار تھا۔ وہ بہت بڑی اور تیز رفتار تھی میرے ساتھ کا بردالا (چوکیدار) غالباً قوم کا کشمیری ساکن بھاگووال سرداراں ضلع گورداسپور تھا۔ چک نمبر ۶۲ میں بھاگووال ضلع گورداسپور کے سکھ لوگ ہی جاکر آباد ہوئے تھے۔ اور وہ گاؤں بھی بھاگووالہ ہی کہلاتا تھا۔

میرے گھر سے نکل آنے کے بعد گھر والوں پر میری جدائی اور رونے کا اتنا گہرا اثر ہوا۔ کہ میرے بعد پھر گھر میں ایک کہرام مچ گیا۔ اور جب والد صاحب اور میرے بھائی مجھے الوداع کہکر واپس گھر گئے۔ تو والدہ نے بہت اصرار کیا۔ کہ میرے لڑکے کو واپس لے آؤ۔ میں نہیں بھیجتی۔ مریگا تو آنکھوں کے سامنے تو ہوگا۔ والد صاحب پر بھی ان کلمات کا اثر ہوا۔ اور انہوں نے پھر کوشش کی کہ مجھے واپس بلوالیں۔ مگر میں چونکہ جلد جلد نکلنے کی فکر میں تھا۔ اور رات بھی اندھیری تھی۔ ہمیں لوٹانے کی کوشش کرنیوالا ہم تک نہ پہنچ سکا۔ اور اس طرح ہم بے روک ٹوک جلد جلد اپنا سفر کاٹتے چلے گئے۔

چک نمبر ۶۲ بھاگووال سے ڈچکوٹ اور وہاں سے گوگیرہ پہنچا تھا۔ میلوں کا تو مجھے حساب نہیں مسافت دور کی تھی۔ راستہ خوفناک تھا۔ چوروں کا خطرہ اور پانی کی قلت تھی۔ کئی گھنٹہ چلنے کے بعد سحر کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے ہمیں آرام کرنے پر مجبور کردیا۔ چنانچہ ایک کف دست میدان میں گھوڑی کا رسہ ہاتھ میں تھام کر ہم دونوں کمر سیدھی کرنے لیٹ گئے۔ شب بیداری۔ تکان اور اس پر ٹھنڈی ہوا کے جھونکے۔ ہماری آنکھ لگ گئی۔ اور پھر اچانک گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ چونکہ دن نکلنے اور پو پھٹنے کے آثار تھے۔ سوار ہوکر پھر جلدی جلدی چلنے لگے۔

دن چڑھا۔ سورج نکلا۔ اور ہوتے ہوتے ۹ بجے کا وقت ہوا ہوگا۔ کہ میرے ساتھی نے چوروں کا خطرہ محسوس کیا۔ اور مجھے بتایا۔ کہ بہت دور سے وہ دو آدمی ہمارے ساتھ ساتھ کبھی آگے کبھی پیچھے کبھی پہلو پر راستہ کاٹتے ہوئے آنکھ بچا کر آرہے ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ ہمارے تعاقب میں صرف موقعہ کی تلاش میں ہیں۔ گھوڑی بہت بڑی تھی اور قیمتی تھی۔ اور اس علاقہ میں ایسے لوگوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ میں نے احتیاطاً اپنے ساتھی کو بھی گھوڑی پر بٹھا لیا۔ اور کوشش کرکے گھوڑی کو جلدی جلدی چلانے لگے۔ حتّٰی کہ چند میل کے سفر کے بعد ہم نے دیکھا وہ لوگ پیچھے رہ گئے تھے۔

چوروں کا خطرہ بھی اور منزل پر پہنچنے کا خیال بھی۔ اس لئے ہم نے کہیں آرام نہ کیا۔ اور سفر کو مسلسل جاری رکھا۔

پیاس نے راہ میں بہت ستایا۔ مگر انہی خیالات کی وجہ سے پانی کی بھی تلاش نہ کی۔ بہت تنگ ہوئے۔ تو راستہ پر ایک بکری والے کی بکریوں کے دودھ سے پیاس بجھانے کی کوشش کی۔ آخر خدا خدا کرکے دریائے راوی کے آثار نظر آئے آبادی دکھائی دینے لگی۔ اور چلتے پھرتے آدمی دکھائی دیئے۔ تب جاکر جان میں جان آئی۔ اور خدا خدا کرکے شام سے پہلے ہی پہلے بلکہ عصر کے وقت ہم لوگ گوگیرا کی بستی میں پہنچ گئے۔ جہاں سے میں یکے پر سوار ہوکر ریلوے اسٹیشن کو روانہ ہوگیا۔ اور بردالے کو خرچ دے کر وہیں رات رہنے اور دوسرے روز صبح واپس جانے کی تاکید کرگیا۔

یہ عجائبات قدرت ہیں۔ جن کا میں نے مجمل سا بیان لکھا ہے۔ اور واقعات ہیں۔ بناوٹ اور مبالغہ کا ان میں دخل نہیں۔ خدائے قادر و توانا کے بھیدوں کا کون احاطہ کرسکتا ہے۔ اور قدرت کی اس کتاب کے باریک در باریک اسرار و معارف کی تہ تک اس کے مقربین کے سوا کون پہنچ سکتا ہے؟

ممکن ہے کسی کو ان واقعات کے علم سے تعجب پیدا ہو۔ اور میرے ظاہری حالات، میری کم عمری و بچپن یا میری خاموشی و کم گوئی کے مدنظر سوء ظن کی بلا کا شکار ہوکر ان باتوں کو بناوٹ یا مبالغہ سمجھے۔ مگر کوتاہ بین ہوگا ایسا شخص اور خدا تعالےٰ کی صفات کا منکر ہوگا ایسا انسان وہ کیا جانتا ہے۔ کہ خدا کے اپنے بندوں میں اسرار ہوتے ہیں۔ جن کو ظاہر بین نظر احاطہ بھی نہیں کرسکتی۔

میں ان حالات کے لکھتے وقت لاحول اور استغفار کا ورد کر رہا ہوں۔ اور خدا سے پناہ مانگتا ہوں۔ کہ ان کے اظہار سے میرے نفس میں کوئی فخر، عجب یا پندار کا شائبہ پیدا ہو۔ کیونکہ ان امور میں میری عقل طاقت یا سمجھ کا قطعاً کوئی دخل نہیں۔ اور یہ محض خدا کا فضل اور اس کی عطا و دین ہے۔ کہ اس ذات والا صفات نے مجھ ناکارہ سے ایسے سلوک فرمائے۔ اور محیر العقول سامان میرے واسطے مہیا کئے۔

میں محض تشکر اور امتنان کی نیت سے اور اس خیال سے کہ سیدنا حضرت اقدس فضل عمر فخر رسل اولوالعزم مظہر الحق والعلیٰ کان اللہ نزل من السماء جیسے خلیفۂ وقت پسر موعودؑ نے بعض خطبات میں مجھ ناکارہ کے بعض حالات کا تذکرہ فرمایا۔ اور پھر میرے عزیز و مکرم مرزا برکت علی صاحب آف آبادان نے بارہا اصرار کیا۔ اور بالآخر اس نیت و غرض سے کہ شائد کوئی صاحب حال نیک نفس اور پاکدل انسان خواہ وہ کسی مذہب و ملت سے تعلق رکھنے والا ہی کیوں نہ ہو میرے ان حالات سے متاثر ہو۔ اور خدا کو پانے کے لئے کمر ہمت باندھ سکے۔ طبائع مختلف ہیں۔ ممکن ہے۔ کسی قلب صافی کیلئے میرے حالات ہی خضر راہ بن جائیں۔

وما ذالک علی اللہ ببعید

اس جملہ معترضہ کے بعد میں اصل بیان کیطرف لوٹتا ہوں کہ گوگیرہ سے میں اس خیال سے بغیر ایک منٹ ٹھہرے ریلوے اسٹیشن کو روانہ ہوگیا۔ کہ رات کو کوئی گاڑی لاہور کو جاتی ہوگی۔ اس میں سوار ہوکر میعاد مقررہ کے اندر سیالکوٹ جہاں سید بشیر حیدر صاحب ان دنوں رہتے تھے پہنچ جاؤنگا مگر سٹیشن پر پہنچ کر معلوم ہوا۔ کہ گاڑی نکل چکی ہے۔ اور اب لاہور کو جانے کیلئے صبح سے پہلے کوئی گاڑی نہ آئیگی میرے دل میں ملال تو ہوا۔ کہ میں گاڑی سے کیوں رہ گیا۔ مگر چارہ نہ تھا۔ ناچار دل کڑا کرکے وہیں پلیٹ فارم پر بیٹھ گیا اور صبح کو روانہ ہونے والی گاڑی کے متعلق حساب لگانے لگا کہ وہ سیالکوٹ کب پہنچے گی۔ مگر مجھے اس خیال سے اور بھی مایوسی ہوئی۔ کہ میں کل شام تک سیالکوٹ نہ پہنچ سکونگا۔ میرے دل میں اپنی ساری محنت کوشش اور دوڑ دھوپ کے رائیگاں جانے کا سخت صدمہ تھا۔ اور چونکہ متواتر کئی رات کی بے خوابی کے ساتھ سفر کی کوفت اور دل کا رنج بھی جمع ہو گئے تھے۔ میری تکلیف ناقابل برداشت ہوگئی۔ اور آخر میں وہیں لیٹ گیا۔ اور ایسا بے ہوش ہوا کہ کوئی رنج یاد رہا نہ فکر۔ علی الصبح گاڑی کی گھنٹی ہوئی۔ مگر میں نے نہ سنی۔ اور پڑا سویا کیا۔ آخر چوکیدار نے جگایا اور کہا۔ "اٹھو گاڑی آتی ہے"

میں گھبراہٹ میں اٹھا۔ اور سوچنے لگا۔ کہ اب کہاں جاؤں اور کدھر کا رخ کروں۔ وقت پر سیالکوٹ تو یہ گاڑی پہنچائیگی نہیں اب ہوگا کیا؟ دل ہی دل میں سوچتا تھا۔ فیصلہ کی کوئی راہ نظر نہ آتی تھی۔ لوگ ٹکٹ خرید کر آرہے تھے۔ اور میں ابھی سوچ رہا تھا۔ کہ یکایک گاڑی سامنے آگئی۔ اور میں بے تحاشا کھڑکی کے سامنے کھڑا ہوا۔ عین اسوقت اللہ تعالیٰ نے دل میں ڈالا کہ ٹکٹ چھانگا مانگا کا خریدو اور چونیاں چلو۔

چنانچہ میں نے چھانگا مانگا کا ٹکٹ خرید لیا۔ اور گاڑی میں سوار ہوکر خدا کی طرف جھک گیا۔ کیونکہ ہر ضرورت اور حاجت میں اُسی کو سچا دستگیر اور راہبر یقین کرتا تھا۔ چھانگا مانگا کا سٹیشن آیا۔ میں گاڑی سے اتر ایک یکے میں سوار ہوکر چونیاں کو روانہ ہوا۔ اور چونیاں پہنچ کر چونگی خانہ کے متصل یکہ سے اتر ہی رہا تھا۔ کہ میرے کان میں یہ آواز آئی۔

"بھائی جی خوب آئے۔ سید بشیر حیدر یہیں ہیں۔"

سبحان اللہ۔ والحمد للہ۔ ولا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر۔ کوئی کیا جانے کہ میرے دل کی اسوقت کیا کیفیت ہوئی۔ اور میرے دل میں کیا کیا خیالات پیدا ہوئے۔ میری روح پانی کی طرح خدائے بزرگ و برتر کے آستانہ پر گری۔ اور انتہائی نیازمندی کا جوش اور ولولہ میرے قلب میں پیدا ہوگیا۔ اور ایک لمحہ کیلئے میں بے حس و حرکت بت بے جان بن کر کھڑا رہ گیا۔ اور اس سکوت اور از خود رفتگی سے آخر میرے مکرم دوست سید زین العابدین شاہ صاحب کے محبت بھرے دل اور ہاتھوں نے لپٹ کر ہوشیار کیا۔

پہلی آواز کو میں ایک غیبی آواز سمجھا تھا۔ اب اپنے یقین اور دل کی تسلی کے لئے دوبارہ سہ بارہ شاہ صاحب سے دریافت کیا۔ کہ کیا واقعی سید بشیر حیدر صاحب یہیں ہیں؟ اور جواب اثبات میں پاکر خدا کا ہزاروں ہزار شکریہ ادا کیا۔ جس نے نہائت ہی ناموافق حالات میں میری خارق عادت رنگ میں مدد فرمائی۔ اور میرے اُس عہد کو پورا کرکے مجھے نئی زندگی عطا کی۔ فالحمد للہ

خدائے بزرگ نے جس طرح خود ہی مجھ سے پندرہ روزہ عہد کرایا تھا۔ ویسے ہی اس پاک ذات نے اس کے ایفاء کے لئے بالکل عجیب در عجیب اور خاص الخاص سامان بھی میسّر فرمائے ورنہ میں اگر اپنی سوچ و بچار یا ساخت پرداخت کے ماتحت کوئی کام کرتا۔ تو یقیناً یقیناً یہ صورت

نہ ہوتی۔ کیونکہ میں اس وقت کے حالات کے مدنظر کرتا جو کرتا۔ اور پھر ضروری نہ تھا۔ کہ کامیابی نصیب بھی ہوتی۔ مگر جو کچھ ہوُا۔ وہ تمام ظاہری سامانوں کے سراسر خلاف ہوُا۔ اور یہی تو خدا کی خدائی اور اس کی چہرہ نمائی ہے۔

میں سید بشیر حیدر صاحب سے ملا۔ اور دوسرے بچھڑے ہوئے دوستوں سے بھی ملاقات کی۔ دو یا تین روز کے بعد سید بشیر حیدر صاحب سیالکوٹ چلے گئے۔ اور میں ایک دو روز کیلئے اور چونیاں ٹھہرا۔ چونیاں میں ہمارے سامان کا کچھ حصّہ ابھی باقی پڑا تھا۔ جو اُسی مکان کے ایک حصّہ میں مقفل پڑا تھا جس میں ہم رہا کرتے تھے۔ اُس کی چابی کسی ضرورت کے ماتحت والدہ محترمہ نے مجھے دی تھی۔ مکان کو کھول کر میں نے والد صاحب کا وہ سامان جس سے پارہ کے گلاس بنایا کرتے تھے۔ اس خیال سے نکال لیا کہ سفر میں کام آویگا۔ کیونکہ والد صاحب کو گلاس بناتے دیکھ کر میں نے بھی پارہ کا گلاس بنانا سیکھ لیا تھا۔

میں گھر سے کچھ زیادہ روپیہ نہ لایا تھا۔ بلکہ اس خیال سے استغنا برتا تھا۔ کہ والدین کو میری حصول ملازمت کا یقین رہے۔ اور میری روانگی میں روک پیدا نہ ہو۔

میں بھی دو تین روز بعد چونیاں سے روانہ ہو گیا۔ مگر نہ سیالکوٹ کو بلکہ میں اس خیال سے کہ ریاستوں میں روپیہ بہت ہوتا ہے۔ پارہ کے گلاس بنا کر فروخت کروں گا۔ اور اس طرح روپیہ جمع کر کے والدین کو بھی بھیجونگا تاکہ اُن کو تسلّی رہے۔ اور پھر سیالکوٹ جاؤنگا۔

میری طبیعت میں ایک قسم کا حیا بچپن سے پایا جاتا تھا۔ جس کی وجہ سے میں کسی کے ہاں جا کر بوجھ بننے سے بچتا رہتا۔ اور ایک قسم کی غیرت تھی۔ چنانچہ اسی خیال کے ماتحت میں نے بغیر کافی روپیہ جمع کئے سیالکوٹ جا کر ایک دوست کا مہمان بننا پسند نہ کیا۔

میں اسی جون ہی کے مہینے میں کپورتھلہ چلا گیا۔ اور چونکہ بالکل ناواقف تھا۔ اور بوجہ گھر سے کبھی نہ نکلنے کے دنیا کے نیچ اونچ سے بھی آگاہ نہ تھا۔ ایک ویران سرائے کا ایک کمرہ لیکر اُس میں ٹھہر گیا۔ اور کچھ سامان خرید کر پارہ کا ایک گلاس بنا لبعض رؤساء کے ہاں لے گیا۔ لوگ گلاس کو دیکھتے۔ میں اس کی اصلیت کے ثبوت میں چند قطرے سیال پارہ کے گلاس میں ڈال دیتا جو سامنے کا سارا دوسری طرف بغیر سوراخ کئے نکل جاتا۔ واہ واہ تو لوگ کرتے۔ اور میری کاریگری کی داد بھی دیتے مگر صرف زبانی ہی زبانی۔ نہ کسی کا ہاتھ جیب کی طرف جاتا اور نہ خریدار بنتا۔ میں ایک ایک کر کے چند امراء کے ہاں گیا۔ جن کا مجھے پتہ لگ سکا۔ مگر سب نے زبانی تعریف ہی پر اکتفا کیا۔ اور اس طرح ایک بھی گلاس نہ بک سکا۔ اور بجائے نفع کے میں اپنی گرہ سے خرچ اٹھا چکا۔

دراصل گلاس کا بنانا چنداں مشکل نہ تھا۔ مشکل تھا تو اس کا فروخت کرنا۔ جس کے لئے بڑی چرب زبانی اور لاف زنی اور ہوشیاری کی ضرورت تھی۔ مگر میں ان باتوں سے بالکل بے بہرہ تھا۔ اِس طرح مجھ پر اپنی کمزوری کا اور بھی حال کھُل گیا۔ اور میں نے جان لیا۔ کہ جیسا خیال تھا۔ ویسا آسان کمانا اور کسی کی جیب سے پیسہ نکالنا نہ نکلا۔

چند روز کے قیام کے بعد میں کپورتھلہ سے امرتسر بٹالہ اور ڈیرہ بابا نانک ہوتا ہوُا اپنے سسرال بمقام ویرم دتاں پہنچا۔ جہاں میری بیوی رہتی تھی۔ اور قریبًا ایک مہینہ ٹھہرنے کے بعد میں پاپیادہ سیالکوٹ کو روانہ ہوُا۔ دوسرے دن سیالکوٹ پہنچ کر سید بشیر حیدر صاحب کی تلاش کی جو اُن دنوں ٹبہ گکے زئیاں کی جمعہ مسجد کے بالمقابل ایک موروثی بالاخانے میں قیام پذیر تھے۔

میں بالاخانے کی بیٹھک میں ٹھہر گیا۔ جو مردانہ کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ مگر کھانے کا انتظام میں نے اپنا علیحدہ رکھا۔ اور باوجود سید صاحب کے تقاضا اور اصرار کے کھانے کا بوجھ اُن پر ڈالنے کو پسند نہ کیا۔ میری ظاہری شکل وشباہت چونکہ ابھی ہندوآنہ تھی۔ میں بازار جا کر ہندوؤں ہی کے ہاں کھانا کھایا کرتا۔ شاہ صاحب سکول جاتے اور میں اکیلا مردانہ میں رہتا۔

تنہائی میں کسی شغل کی تلاش ہوئی۔ آخر شاہ صاحب کی کتابوں کو الٹ پلٹ کر ایک کتاب جو اپنے نام کی وجہ سے مجھے بہت بھائی۔ اٹھا کر مطالعہ شروع کر دیا۔ کتاب کا نام تھا "**نشان آسمانی**"۔ کتاب دلچسپ اور نہائت مناسب حال تھی۔ لہذا میں نے اُسے ختم کئے بغیر نہ چھوڑا جب یہ ختم ہو گئی۔ تو ایک اور کتاب مل گئی۔ جس کا نام تھا "**انوار الاسلام**"۔ اُسے بھی لیا۔ اور بالاقساط ختم کر دیا۔

اُن دنوں عبداللہ آتھم والی پیشگوئی کا بہت شور تھا۔ اور سکول ٹائیم کے بعد سید بشیر حیدر صاحب کے مردانہ پر اس مسئلہ پر عمومًا روزانہ بحث ہوُا کرتی تھی۔ جس کو میں شوق سے سنا کرتا۔ اوپر کی دونوں کتابیں جن کا میں نے ذکر کیا ہے سیدنا حضرت اقدس مسیح پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تصنیف تھیں۔ جن میں سے انوار الاسلام میں عبداللہ آتھم والی پیشگوئی کا ذکر تھا۔ اور انعامی اشتہار بھی چار ہزار روپے تک تھے۔ اور میں نے اس کو بڑے شوق اور توجہ سے پڑھا تھا۔

ایک فریق حضرت اقدسؑ کی صداقت پر اور دوسرا مخالفت پر دلائل دیا کرتے تھے۔ اور بعض اوقات بحث نہائت ہی پُرجوش رنگ اختیار کر جایا کرتی تھی۔ ایک طرف صداقت کے دلائل دینے والے سادات فیملی کے نوجوان تھے۔ جن میں سے مکرمی سید بشیر حیدر صاحب، سید رشید احمد صاحب اور سید محمد سعید صاحب کے نام مجھے یاد ہیں۔ اور مخالف پارٹی میں بعض پٹھان (ککے زئی) اور کوئی ایک دو سید بھی تھے غالبًا۔ میں بھی چونکہ پاس بیٹھا ہوُا کرتا تھا۔ لہذا مصدقین حضرت اقدسؑ کبھی مجھے بھی مخاطب کر لیا کرتے۔ "کیوں بھائی جی ٹھیک ہے نا۔"

میں نے چونکہ حضور کی کتاب انوار الاسلام پڑھی تھی۔ اور توجہ اور شوق سے پڑھی تھی۔ میں مصدقین کی تائید میں ہوُا کرتا تھا۔ مگر مخالفین کو یہ پسند نہ تھا۔ وہ مجھے یہ کہکر کہ بھائی جی یہ ہمارے مذہبی معاملات ہیں۔ آپ ان کو نہیں سمجھتے۔ آپ نہ بولیں، روکنا چاہتے۔ مگر ایک حق بات جس کی مجھے سمجھ آ چکی تھی۔ کہنے سے میں نہ رکتا۔ اور ان کو چیلنج کیا کرتا۔ کہ مجھ سے گفتگو کریں۔ مگر وہ مجھ سے بات کرنا پسند نہ کرتے۔

غرض اس طرح اس بالاخانے پر مجھے سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الف الف صلوٰۃ والسلام کا نام پہنچ گیا اور حضور کا کلام بھی مجھے میسّر آ گیا جس کو میں نے شوق سے پڑھا۔ اور وہ میرے دل وجان میں رچ گیا۔ اس سے پہلے مجھے حضور پاک کے متعلق کوئی علم واطلاع نہ تھی۔ گو میرے دل میں اسلام کی محبت گھر کر چکی تھی۔ اور ایمان میرے رگ وپے میں سرایت کر گیا ہوُا تھا۔ مگر سیدنا مسیح پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کلام معجز بیان پڑھنے کے بعد میرے دل میں ایک نیا نور معرفت اور عرفان پیدا ہو گیا۔ ابھی تک مجھے نماز نہ آتی تھی۔ مگر اب میں نے سبقًا سبقًا دو تین روز میں نماز یاد کر لی۔ اور باقاعدہ نماز پڑھنا بھی شروع کر دیا۔ میرے میزبان پڑھتے یا نہ پڑھتے۔ مگر میں وقت پر نماز کیلئے کھڑا ہو جایا کرتا۔

کچھ عرصہ کے بعد مجھے معلوم ہوُا۔ کہ میرے پاس جو روپیہ تھا۔ وہ خرچ ہوتے ہوتے بہت تھوڑا باقی رہ گیا ہے۔ میں نے اس اظہار کے بغیر ہی سید بشیر حیدر صاحب سے چند روز کی اجازت چاہی۔ کہ اپنے بڑے چچا صاحب سے مل آؤں (میرے والد صاحب کے سب سے بڑے بھائی مہتہ ہیمراج پشاور کے پاس ایک گاؤں میں بسلسلہ ملازمت پٹوار رہتے تھے۔ اور وہیں انہوں نے مکان وغیرہ بنا لیا تھا اُن کے اولاد نہ تھی) شاہ صاحب نے پوچھا بھی کہ اگر خرچ کے واسطے جاتے ہو۔ تو نہ جاؤ۔ مگر میں نے عذر کر کے ملاقات کے لئے اجازت لے لی۔ اور قریبًا ایک مہینہ اس سفر میں خرچ ہو گیا۔ چچا صاحب سے واپسی پر میں نے کچھ خرچ وغیرہ بھی لے لیا۔ اور واپس سیالکوٹ آ گیا۔ اس واپسی کے چند ہی روز بعد میں نے سید بشیر حیدر صاحب سے کہا۔ کہ اب میں اپنے ان خیالات کو چھپا نہیں سکتا اور چاہتا ہوں۔ کہ اظہار اسلام کر دوں۔

یہ سنکر سید صاحب جو دل سے چاہتے تھے۔ مگر مجھے زبانی کبھی کچھ نہ کہتے تھے۔ خوش ہوئے۔ اور فورًا جا کر حضرت سید میر حامد شاہ صاحب کے پاس ماجرا عرض کر دیا۔ انہوں نے وقت دیگر مجھے بلوایا۔ میں میر حامد شاہ صاحب کے مکان پر اُن کی خدمت میں حاضر ہوُا محبت اور اخلاص سے پیش آئے۔ اور میری زبان سے میری غرض ومقصد سنکر مجھے قریبًا ایک گھنٹہ تک نہائت مؤثر پیرایہ میں تلقین فرماتے رہے۔ شاہ صاحب نے مجھے یقین کے ہر سہ مدارج کے متعلق کھول کر سنایا اور میرے علم میں بہت قیمتی معلومات کا اضافہ فرمایا۔

مگر اظہار اسلام کے متعلق مجھے یہ مشورہ دیا کہ آپ کے بعض رشتہ دار چونکہ یہاں ہیں (میرے بعض

رشتہ دار پولیس اور دوسرے محکمہ جات میں معزز عہدوں پر تھے) لہذا اندیشہ ہے کہ وہ لوگ روک ڈالیں گے۔ یا شور و شر کرکے فساد برپا کریں۔ بہتر ہو کہ تم قادیان چلے جاؤ۔

قادیان کا نام اُن کی زبان سے نکلنا تھا کہ میرا دل سرور سے بھر گیا اور مجھے پورا انشراح ہوگیا کیونکہ شاہصاحب سید بشیر حیدر صاحب کے بالاخانے کے قیام کے ایام میں قادیان کے نام سے بہت مانوس ہو چکا تھا میں نے شاہصاحب کی خدمت میں عرض کیا۔ بہت اچھا میں قادیان چلا جاتا ہوں۔ شاہصاحب نے میرے واسطے ایک خط لکھنا شروع کیا اور میں دل میں قادیان کا ایک نظارہ بنانے میں مصروف ہوگیا۔ اور اس بات پر خوش تھا۔ اس وقت کے خیال کے مطابق قادیان کا نقشہ جو میں نے دل میں تجویز کیا۔ مسجد اقصٰے کو بعینہ اس کے مطابق پایا۔ شاہصاحب نے خط لکھکر مجھے دیا۔ اور دعا کر کے مجھے رخصت فرمایا اور میں اُسی شام کی گاڑی سے تن کے تینوں کپڑے لیکر روانہ قادیان ہوگیا۔ کیونکہ میرے خیال کے مطابق وہاں صرف یہی کام تھا کہ کوئی بزرگ ہونگے اُن کی خدمت میں حاضر ہو کر اظہارِ اسلام کر کے نذر و نیاز چڑھا کر واپس چلا آؤنگا اور پھر کوئی کام کرنے لگونگا۔ اور یہ خیال تھا۔ کہ وہاں اظہارِ اسلام بطور تبرک ہوگا۔

جس روز میں سیالکوٹ سے روانہ ہوا جمعرات تھی۔ میں بٹالہ اسٹیشن سے اتر کر قادیان کے راستہ کی تلاش میں مصروف ہوا۔ اتفاقًا ایک یکّہ قادیان کا مل گیا۔ جس سے دو آنے مقرر کرکے دو اور ہندو سواریوں کے ساتھ میں قادیان پہنچا۔

یکّہ بان غالبًا غفارا تھا کشمیری۔ اُس نے مجھے ریتی چھلّا کی طرف جدھر بڈھے شاہ کی دوکانات ہیں اتارا۔ وہ دن جمعہ کا تھا کہ میں دارالامان پہنچا۔ میری شکل و شباہت چونکہ ابھی ہندوآنہ تھی۔ لہذا بازار کے لوگ جب میں اُن سے مرزا صاحب کے مکان کا پتہ دریافت کرتا تعجب کرتے۔ اور مجھے پکڑ کر بٹھا لیتے اور غرض و غائیت اور مقصد دریافت کرنے کے درپے ہو جاتے۔ چنانچہ بڈھے شاہ کی سہ منزلہ دوکانات سے لے کر چوک تک پونچتے پونچتے مجھے دس جگہ روکا گیا ہوگا۔ جہاں سے میں کسی نہ کسی طرح دامن چھڑا کر آگے ہی آگے چلتا گیا۔

سارے ہندو بازار میں چرچا ہوگیا اور جا بجا باتیں ہونے لگیں۔ لوگوں نے مجھے روکنے میں پورا زور صرف کیا۔ اور بعض تو ہاتھ پکڑ کر بیٹھ رہتے تھے۔ مگر میں جان گیا۔ کہ یہ لوگ روکنا چاہتے ہیں۔ آخر زور سے پلّا چھڑا چھڑا کر خدا خدا کر کے چوک میں پہنچا۔ جہاں میاں علی بخش اور نبی بخش دو بھائیوں کی عطاری کی دوکان تھی اُن سے دریافت کیا۔ تو انہوں نے راستہ بتایا۔ ورنہ ہندو کسی ایک نے بھی مرزا صاحب کے مکان کا راستہ نہ بتایا تھا۔

مسجد مبارک کی کوچہ بندی کے نیچے پہنچکر جہاں اوپر جانے والی سیڑھیوں کے دروازہ کے ساتھ سیڑھیوں کی ڈاٹ کے نیچے ایک چار پائی پر دو شخص بیٹھے تھے۔ ایک قرآن شریف پڑھ رہے تھے۔ اور دوسرے پڑھا رہے تھے۔ جمعہ کی نماز ہو چکی تھی۔

مجھے سید میر حامد شاہ صاحب نے جو خط دیا تھا۔ وہ حضرت مولانا مولوی عبدالکریم صاحب مرحوم کے نام تھا مگر مجھے اُن کا حلیہ وغیرہ کوئی نہ بتایا گیا۔ میں نے چار پائی کے برابر پہنچکر السلام علیکم کہا۔ میری آواز پر پڑھانے والے بزرگ نے توجہ کی۔ تو میں نے وہ خط نکالکر اُن کے حوالے کر دیا بغیر اس علم کے کہ وہ صاحب ہیں کون۔ مجھ سے خط لے کر اُس بزرگ نے مجھے سر سے پاؤں تک دو تین مرتبہ گھور گھور کر دیکھا اور بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔

قرآن پڑھانے والے بزرگ حضرت مولوی عبدالکریم صاحب تھے۔ اور پڑھنے والے میرے محسن بھائی عبدالرحیم صاحب نَومسلم خط پڑھ کر فرمایا۔ میرا ہی نام عبدالکریم ہے۔ اتنے میں مؤذن نے اذان کہی اور ہم سب اوپر مسجد مبارک میں چلے گئے۔ اذان حافظ معین الدین صاحب نے کہی جو حافظ معنا کے نام سے مشہور تھے۔ مجھے مولوی صاحب نے وضو کی جگہ بتائی۔ اور خود مسجد مبارک کے درمیانی کمرہ میں تشریف لے گئے۔ مجھ سے پہلے کوئی صاحب وضو کر رہے تھے۔ اور اس طرح مجھے کچھ انتظار کرنا پڑا۔ اُن دنوں مسجد مبارک میں جانے کیلئے ایک ہی سیڑھی تھی۔ جو آجتک بھی موجود ہے۔ اور مسجد مبارک کی کوچہ بندی میں جانب غرب اس کا دروازہ کھلا ہے۔ اور یہ تنگ سیڑھی ایک چکر کھا کر مسجد مبارک کے تیسرے حصّہ میں کھلتی تھی۔ سیڑھی کے بائیں جانب ایک غسل خانہ تھا جس میں وضو اور غسل کے لئے پانی رکھا رہتا تھا اور مسجد مبارک کی سطح سے اُن دنوں اُس کی سطح نیچی تھی۔ اور اسی غسل خانہ میں ایک لکڑی کی سیڑھی لگی تھی۔ جس کے ذریعہ گول کمرہ کی چھت پر جاتے۔ اور وہاں سے دوسری سیڑھی کے ذریعہ غسل خانہ کی چھت پر پہنچتے۔ اور مسجد مبارک کی بالائی چھت دو یا تین سٹیپس کے برابر غسل خانہ کی چھت سے بھی اونچی تھی۔ یہ غسل خانہ بعد میں مولوی محمد علی صاحب کیلئے دفتر بن گیا پہلے تخت پوش وغیرہ لگا کر اُس کی چھت اونچی کی گئی۔ مگر بعد میں مستقل طور سے اُسے اونچا کر دیا گیا۔

میں وضو کر کے فارغ ہو کر مسجد مبارک کے درمیانی کمرہ کے دروازہ پر پہنچا (اس زمانہ میں مسجد مبارک کے تین حصّے تھے۔ (۱) حجرہ بیت (۲) درمیانی کمرہ جس میں سے بیت الذکر کو کھڑکی کھلتی ہے۔ اور آج تک موجود ہے۔ سیّدنا حضرت مسیح پاک علیہ الصلوٰۃ والسّلام ابتدائی ایّام میں اسی کھڑکی کے رستہ مسجد مبارک میں تشریف لایا کرتے تھے۔ اور اس کھڑکی کے ساتھ ہی دیوار کے ساتھ صف اوّل کی دائیں طرف کھڑے ہو کر نماز ادا فرمایا کرتے تھے۔ اس درمیانی کمرہ میں ایک کھڑکی جنوبی جانب بھی ہُوا کرتی تھی۔ جس کے نیچے خراس والا شکستہ مکان تھا۔ اور تیسرا کمرہ وہ حصّہ مسجد تھا جس میں نیچے سے آنیوالی سیڑھی کھلتی تھی۔ اور غسل خانہ کا دروازہ بھی اسی میں کھلتا تھا۔ اس تیسرے حصّہ مسجد میں بھی ایک کھڑکی جانب جنوب کھلتی تھی۔ حجرہ میں بھی دو کھڑکیاں تھیں۔ ایک تو جانب غرب کھلتی تھی۔ جو آجتک بعینہٖ موجود ہے۔ اور دوسری جانب شمال تھی۔ مگر اُس میں اتنا تغیّر سیّدنا حضرت مسیح پاک علیہ الصلوٰۃ والسّلام ہی کے زمانہ میں ہو گیا تھا۔ کہ اس میں لوہے کی سلاخیں لگا دی گئیں۔ تاکہ بچوں کے گرنے کا اندیشہ نہ رہے۔

سیّدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مکان کو جانے کا ایک دروازہ اسی سیڑھی (چھوٹی سی) میں کھلتا تھا۔ جو مسجد مبارک میں داخل ہونے سے ایک دو سیڑھی پہلے ہی جانب شمال لگا ہُوا تھا۔ اور آجکل وہ دروازہ تو گو بند ہے۔ اور اس کی بجائے مسجد مبارک میں سے ایک دروازہ کھول دیا گیا ہے۔ مگر پہلے دروازہ کے آثار بھی (چوکھٹ) ابھی موجود ہیں۔

خراس والی زمین مرزا نظام الدین صاحب وغیرہ کی تھی۔ اُن سے خرید کر اوپر سے مسجد مبارک میں شامل کر لی گئی۔ اور نیچے کے حصہ میں دفتر محاسب وغیرہ بن گئے۔ اور اس تغیّر کی وجہ سے اصل مسجد مبارک کی شکل اگرچہ قائم نہیں رہی مگر دیواروں کے نشان اب تک موجود ہیں۔

میں وضو کے بعد جب دروازہ پر پہنچا۔ تو درمیانی حصّہ میں آٹھ یا دس آدمیوں کا مجمع تھا اور انہی میں سیّدنا حضرت مسیح پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی تشریف فرما تھے۔ مگر میں نے حضور کو نہ پہچانا کیونکہ مجلس میں کوئی امتیاز نہ تھا بلکہ سب کے سب برابر فرش مسجد پر ایک حلقہ کی صورت میں جمع تھے۔

حضرت مولوی عبدالکریم صاحب نے اشارہ سے مجھے آگے بلایا اور سیّدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی طرف اشارہ کر کے مجھے سلام کرنے کو کہا۔ تب میں نے جانا پہچانا۔ اور ادب سے سلام کیا۔ جس کا سیدنا حضرت اقدس مسیح پاک علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے جواب دے کر سر اٹھایا اور نیم وا چشم مبارک سے مجھ پر نظر ڈالی۔

معلوم ہوتا ہے۔ کہ حضورؑ اذان سے پہلے ہی مسجد میں تشریف لے آئے تھے۔ یا کم از کم اذان ہوتے ہی آ گئے تھے۔ (اُس زمانہ میں عمومًا حضور اذان سے پہلے مسجد میں تشریف لے آیا کرتے۔ اور بعض اوقات خود حکم دیکر اذان دلوایا کرتے تھے) اور میرے وضو کر کے پہنچنے سے قبل ہی حضرت مولوی عبدالکریم رضٖ صاحب نے حضور سے میرا ذکر کر لیا تھا۔ حضرت مولانا مولوی نورالدینؓ صاحب بھی مجلس میں موجود تھے۔

سیّدنا حضرت اقدسؑ نے مجھ پر نظر ڈالی اور فرمایا:۔

"مولوی صاحب! یہ لڑکا تو ابھی بچہ معلوم ہوتا ہے۔ اور نابالغ نظر آتا ہے۔ ایسا نہ ہو ہندو کوئی فتنہ کھڑا کر دیں۔ یہ لوگ ہمیشہ موقعہ کی تاک میں رہتے ہیں۔" اس پر حضرت مولانا مولوی عبدالکریمؓ صاحب نے ایک طرف مجھے اشارہ کیا۔ اور دوسری طرف حضور کی خدمت میں عرض کیا۔ کہ لڑکا ہوشیار ہے۔ اور سوچ سمجھ کر یہاں آیا ہے۔ اور حضرت مولانا مولوی نورالدین رضٖ صاحب نے بھی مولوی صاحب کی تائید میں کوئی ایسی ہی بات

عرض کی۔ ادھر میں خود عرض کرنے کھڑا ہو گیا۔ حضور میں تو مدت ہوئی دل سے مسلمان ہوں۔ نماز مجھے آتی ہے۔ اور پڑھتا ہوں حضور کی کتاب انوار الاسلام اور نشان آسمانی میں نے اچھی طرح سمجھ کر پڑھی ہیں۔ مجھے اسلام کا شوق ہے۔ میں جوان ہوں نابالغ نہیں۔ وغیرہ

اِس پر اللہ تعالےٰ نے میرے آقائے نامدار کو انشراح بخشا۔ اور حضور پر نور نے مجھے قبول فرما کر کلمہ پڑھایا اور داخل اسلام کیا۔ فالحمدللہ، الحمدللہ، الحمدللہ۔ رب توفنی مسلمًا والحقنی بالصالحین

اکتوبر ۱۸۹۵ء کا زمانہ تھا۔ جب میں دارالامان قادیان پہنچا اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے فضل اور رحم سے ہوُا۔ میری کسی کوشش یا سعی کو اس میں کوئی بھی دخل نہ تھا۔ م قادیان کے نام سے بھی ناآشنا تھا۔ اور نہ جانتا تھا کہ قادیان ہے کدھر دو تین ماہ قبل کپور تھلہ سے اپنے سسرال کو جاتے ہوتے بھی میں ٹبالہ سے ڈیرہ بابا نانک کو گیا تھا قادیان کا کوئی علم ہوتا تو تبھی چلا آتا۔ سسرال جانا میرا اصل مقصد تو تھا نہیں۔ اصل مقصد تو وہی تھا۔ جو خدا نے اب میسر فرمایا۔

تاریخیں اور مہینے مجھے ٹھیک تو یاد نہیں تخمینہ اور اندازہ سے میں سمجھتا ہوں۔ کہ غالبًا اکتوبر ہی کا مہینہ ہوگا۔ اور وہ بھی زیادہ سے زیادہ اکتوبر کا ابتداء یا ستمبر کا آخر۔ مگر ۱۸۹۵ء میں تو قطعًا قطعًا کوئی شبہ نہیں۔ فرق ہوگا تو دنوں یا زیادہ سے زیادہ ہفتوں کا ہو گا۔ اور یہ بھی امر یقینی ہے۔ کہ اکتوبر کے ابتداء سے وہ زمانہ کسی حال میں بھی آگے نہیں جاتا کچھ پہلے ہو تو ہو۔

قادیان پہنچکر حضرت اقدس کے دربار میں حاضر ہونے میں جتنی روک مقامی بازار کے ہندو لوگوں کی طرف سے مجھے پیش آئی۔ وہ مجھے کبھی نہیں بھولی۔ ایک انسان ایک اجنبی اور نووارد کو روکنے کے جس قدر وسائل اختیار کر سکتا ہے وہ انہوں نے سارے ہی جمع کیئے۔ پیار بھی کیا۔ ہمدردی بھی جتائی۔ خاطر و مدارات بھی کی۔ اور تواضع سے بھی پیش آئے کھانے اور پانی کی تو نہ صرف صلح ہی کی، بلکہ تیار کرانے کو گھروں میں پیغام بھیجدیئے۔ اور آخر جب کام نکلتا نظر نہ آیا۔ تو کچھ سختی بھی استعمال کرنے کی کوشش کی۔ مگر اللہ تعالےٰ نے محض اپنے فضل ہی سے میری دستگیری فرمائی اور دروازہ پر پہنچا کر اندر بھی داخل خود اُسی نے کر دیا۔ ورنہ میں اپنی طاقت سے اُن مشکلات اور روکاوٹوں کا مقابلہ کرنے کے ہرگز ہرگز قابل نہ تھا۔

لوگ کہتے ہیں۔ کہ نالائق نہیں ہوتا قبول
پر میں تو نالائق بھی ہو کر ...... فضل ہے اُسی کا
ورنہ من آنم کہ من میدانم

اے میرے آقا و مالک اور اے میرے ہادی و رہنما!!!

جس طرح تو نے خود اپنے ہاں اپنے ہی ہاتھ سے مجھ ناکارہ انسان، انسان نہیں انسانوں کی بھی عار بلکہ محض ایک کرم خاکی کو بچپن اور کم عمری میں نوازا۔ اور خود میرے دل میں تخم ایمان بو کر اس کی آبیاری فرمائی۔ اسے پودا بنایا۔ اور ہر قسم کی بادِ صرصر اور مخالف ہواؤں سے محفوظ رکھتے ہوئے وحوش اور درندوں کی پامالی سے بچا کر اس **باغ احمد** میں پہنچایا اور اس گلستان میں اپنے محض فضل سے ایسی جگہ دلائی۔ جو میرے وہم و گمان میں بھی نہ آسکتی تھی۔ اور جہاں میرے خواب و خیال کو بھی رسائی نہ تھی۔ اے میرے پیارے اور میری جان کی جان!! جس طرح یہ سب کچھ آپ نے خود کیا۔ اسی طرح بلکہ اس سے بھی کہیں بڑھ کر آئندہ بھی میرے ساتھ معاملہ فرمائیو۔ اور طرفۃ العین کے لئے بھی مجھے میرے نفس کے سپرد نہ کریو۔ بلکہ میرا کھانا اور پینا، سونا اور جاگنا، میرا اٹھنا اور بیٹھنا، خلاصہ یہ کہ میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ ہی آپ اپنی رضا کے مطابق کر دیں۔

اے حیّ و قیوم و قدیر تیری عطاؤں کو کوئی روکنے والا نہیں۔ جیسا کہ جسے تو رد کر دے کوئی بچانے والا بھی نہیں۔ میں تجھے تیری کبریائی، عظمت و جبروت کا واسطہ دیکر پکارتا ہوں۔ اور تیرے آستانہ پر گر کر التجا کرتا ہوں۔ کہ مجھے ایک خاک آلود بیج کی طرح اپنی ربوبیت کی طفیل اتنا بڑھا۔ پھیلا اور پھلدار بنا۔ کہ نسلیں اور قومیں میرے سایہ تلے آرام پائیں۔ تیری ہر قسم کی مخلوق میرے بار و بر سے مستفیض ہو۔ میرے اثمار اور میرے پھلوں میں اپنے کرم سے ایسی شیرینی، لطافت اور نفاست بھر دے۔ کہ دنیا اُن کی طلبگار رہو۔ اور ان کو پا کر سیری حاصل کرے اور روحانی حاجات، اور جسمانی ضرورتیات میں وہ حاجتمندوں کی مراد بنیں۔

اے قادر و توانا! تیرے لئے کوئی کام انہونا نہیں۔ ناممکن کا لفظ تیری قدرت کے مقابل میں غلط محض ہے۔ اور تیرے صرف ایک "کُنْ" میں دنیا جہان کے سارے کام ہو سکتے ہیں۔ اپنی خاص قدرت نمائی فرما اور میری ساری اولاد (لڑکے اور لڑکیاں، نواسے اور پوتے پوتیاں، داماد اور بہوئیں، ان کی نسلیں اور نسلوں کی نسلیں، پشتوں تک) میں ایسا خارق عادت تغیر پیدا کر دے۔ اور اُن کو نیک متقی اور پارسا بنا۔ کہ وہ تیری قدوسیت و سبّوحیّت، تیری رحمانیت رحیمیت اور ربوبیّت اور ساری ہی صفات کے مظہر کامل ہو جائیں۔ اور تجھ میں ایسے فناہ ہوں کہ تیری مرضی اور رضاء کے سوا اُن کا اپنا کچھ بھی باقی نہ رہ جائے وہ حقیقی معنوں میں تیرے بندے اور تو ان کا حقیقی خدا ہو۔

اے ستّار و غفّار ہستی! میری پردہ پوشی فرما۔ اور میرے گناہوں اور معاصی کو معاف فرما۔ اور ایسا ہو کہ میری کوئی غلطی، معصیّت یا گناہ میری دعاؤں کی قبولیت میں روک نہ بن سکے۔

اے شہنشاہوں کے شہنشاہ! میں تجھ سے تیری تمام صفات کاملہ کے صدقے یہ التجا کرتا ہوں۔ کہ جس در سے تو نے مجھ پر اپنی چہرہ نمائی فرمائی۔ اس کو ہمیشہ ہمیش مجھ پر اور میری اولاد پر وا رکھیو۔ اور ہمیں اس خاندان کی غلامی کی عزت و سعادت سے کبھی بھی محروم نہ کریو۔ اور سچی وفاداری۔ اور نیازمندی اور خدمتگذاری کے شرف سے مشرف فرمائے رکھیو۔ اے سارے فضلوں کے مالک ہم خالی ہاتھ ہیں۔

کسی عمل پر بھروسہ نہیں۔ نجات تیرے فضل سے وابستہ ہے۔ تیری اسی صفت کے طفیل تجھ سے بغیر حساب پار اترا چاہتے ہیں۔ اے سارے پاکباز اور مقدسین کے خدا! اے انبیاء و مرسلین اور سیدالکونینؐ خاتم المرسلینؐ کے آقا!! اور اے اس نبیؐ آخرالزماں اور خاتم النبیینؐ کے بروز کامل اور مظہر اتم کے ربّ! ان تمام پاکباز مقدسین پر اور اُن کے سارے ہی غلاموں پر امتوں پر اُن کے خلفاء اور ازواج پر گذر چکے یا موجود ہیں یا آئندہ ہونگے ہزاروں ہزار رحمتیں نازل فرما۔ درود پہنچا۔ اور اپنے بے انتہا افضال و برکات سے اُن سب کو بہرہ ور فرما کر لاانتہا مدارج عطا فرما۔ اور ان مقدسین کے طفیل مجھ ناکارہ اور درماندہ کی پکار سُن لے مجھے سموچا اپنا بنا لے۔ اور تو میرا ہو جا۔ میری نسلوں میں ایسی برکت دے کہ گنی نہ جائیں۔ اور اُن میں ایسی نیکی اور پاکیزگی بھر دے۔ کہ قابل رشک بن کر ہمیشہ خدا نما رہیں۔ اور تیرے شعائر بن جائیں۔ تا کوئی یہ نہ کہ سکے۔ کہ تیرے ہاں تیرے اپنے ہاتھ کا لگایا ہوُا پودہ بے برگ و بار رہ گیا۔

اے ہمارے خدا! اے علیم و بصیر ہستی!! تیرا پاک دین اسلام اسوقت دنیا میں نہائت ہی بے کسی اور کسمپرسی کی حالت میں ہے۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی ہے۔ کہ نزع اور جان کنی میں پڑا ہے۔ بیگانے تو درکنار خود اپنے بھی دشمن بن گئے ہیں۔ تیرے مقدسین اور راستبازوں کی توہین کی جاتی ہے۔ اور اعلانیہ اُن کے نام پر گند اچھالا جاتا ہے۔ اور ان معصوموں پر دائیں اور بائیں آگے اور پیچھے چاروں طرف سے تیر برسائے جاتے ہیں۔ اسی پر بس نہیں جو کبھی تیرے دین کی حمائت یا تیرے مقدسین کی برأت کے لئے کھڑا ہوتا ہے۔ دنیا کے کیڑے اور ظلمت کے فرزند کیا اپنے اور کیا پرائے سبھی ان پر پل پڑتے ہیں۔ اور ایک جان ہو کر ایک ہی کمان سے تیر برسانے لگ جاتے ہیں۔

ہمارے آقا! تو خود آ۔ اور اس غریب کو دشمنوں کے نرغے سے نکال۔ اس کی حفاظت فرما۔ اور ربوبیت کر۔ تا وہی پہلی سی تازگی، شادابی اور ملاحت اس میں پیدا ہو اس کی خزاں کو بہار سے بدل دے۔ اور اس کا خوبصورت چہرہ دکھا کر پھر دنیا کو اس کی گود میں جمع کر دے۔ تا اس کی برتری دنیا پر ظاہر ہو۔ دنیا کی آنکھیں کھول۔ کہ اس نور سے اپنی آنکھوں کو نورانی کریں۔ اور اس آب حیات سے اپنی تشنگی دور کر کے ابدی زندگی اور جاودانی حیات کے وارث ٹھہریں۔ آمین اَللّٰھُمَّ آمین ثم آمین

غرض اس طرح اللہ تعالےٰ نے مجھ ناچیز کو کفر و شرک کے اتھاہ گڑھے سے اپنا دست قدرت بڑھا کر نکالا۔ اور اپنے پیارے مسیح کے ذریعہ مجھے قبول فرما لیا۔ میں قادیان میں رہنے لگا۔ بھائی عبدالرحیم صاحب (نومسلم) جو مجھ سے چھ سات ماہ قبل قادیان پہنچ چکے تھے کے دل میں اللہ تعالیٰ نے میرے لئے جگہ بنا دی۔ اور وہ میری ہر طرح کی نگرانی تعلیم و تربیت کا خیال رکھنے لگے جزاھم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء فی الدنیا والآخرۃ

شیخ عبدالعزیز صاحب (نومسلم) جو علاقہ ریاست جموں کے باشندے تھے مجھ سے قریباً دو ہفتہ قبل قادیان میں آچکے تھے۔ وہ بھی میرے ساتھ تعلق محبت رکھتے اور مل جل کر رہتے تھے۔

اس زمانہ میں صرف چند لوگ قادیان میں رہتے تھے اور باہر سے آنے والوں میں عموماً حضرت مفتی محمد صادق صاحب مرزا ایوب بیگ صاحب مرحوم اور ان کے بڑے بھائی مرزا یعقوب بیگ صاحب اور کپورتھلہ کی جماعت کے بعض پرانے بزرگ ایسے ہیں۔ جن کے متعلق بخوبی یاد ہے۔ کہ اکثر آتے رہتے تھے۔ مگر سلسلہ آمد مہمانان بہت ہی کم اور محدود تھا۔

لنگرخانہ اس زمانہ میں اُس حصۂ مکان میں تھا۔ جہاں آجکل حضرت اقدس خلیفۃ المسیح ثانی ایدہ اللہ کے حرم اول کی ڈیوڑھی ہے۔ اور وہ حصہ سارے کا سارا خام عمارت تھی۔ کھانا صبح کے وقت گول کمرہ میں اور شام کو مسجد مبارک کی بالائی منزل پر بعد نماز شام کھلایا جاتا تھا۔ اور سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام خود بھی شرکت فرماتے تھے۔ مسجد مبارک کی بالائی منزل پر دو شہ نشین تھے، ایک تو جنوبی آثار کے اوپر جیسا کہ آجکل بھی ہے۔ مگر سیخ وغیرہ نہ تھیں۔ اور دوسرا مسجد کے حجرہ کے اوپر کی غربی دیوار کے آثار پر سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام عموماً نماز شام کے بعد اسی شہ نشین پر رونق افروز ہوا کرتے تھے۔ جو حجرہ کے غربی آثار پر بنا ہوا تھا۔

گول کمرہ کا صرف وہی حصہ تھا۔ جو گول کمرہ کی صورت میں مسقف ہے۔ اگلے حصہ کی چار دیواری بعد میں بنائی گئی اور اور اب جہاں گول کمرہ کا صحن ہے۔ یہ حصہ پہلے بالکل کھلا اور میدان میں شامل تھا۔ کھانا اس زمانہ میں ملک غلام حسین صاحب پکاتے تھے۔ اور ابتداء میں چپاتیاں ہوا کرتی تھیں جو غالباً گھر کے اندر ہی خادمات پکاتی تھیں۔ تنور کی روٹی بعد میں شروع ہوئی۔ کھانے میں عموماً دال اور کبھی کبھی سبزی گوشت، بعض اوقات ایک وقت دال دوسرے وقت سالن ہوتا تھا۔ دال عموماً چنے کی ایسی پتلی مگر ایسی لذیذ کہ پیالہ اٹھا کر گھونٹ گھونٹ پی جایا کرتے تھے۔

سیدنا حضرت اقدس مسیح پاک علیہ الصلوٰۃ والسّلام پہلے پہلے عام دسترخوان ہی پر شمولیت فرمایا کرتے تھے حضور ؑ نہائت ہی کم کھاتے۔ چپاتی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا کرتے ننھا سا حصّہ لے کر انگلیوں میں رول رول کر بعض اوقات اس میں سے بھی بعض حصّہ الگ کر دیتے۔ اور کچھ کھایا کرتے ایسا معلوم ہوا کرتا تھا۔ کہ حضور محض شمولیت کی غرض سے تشریف فرما ہیں۔ اور دوسروں کو کھلا رہے ہیں خود محض برائے نام نوش فرماتے تھے۔ حضور کے سامنے اگر کوئی خاص چیز آتی حضور اُسے تقسیم فرما دیا کرتے تھے دسترخوان پر باتیں بھی ہوا کرتی تھیں۔

ایک وقت آیا۔ کہ بعض ناگوار واقعات کی وجہ سے حضور نے عام دسترخوان پر تشریف لانا بند کر دیا۔ اور اس طرح دو دسترخوان الگ الگ ہو گئے۔ اور حضور بعض خاص اصحاب اور مہمانوں کے ساتھ تناول فرمانے لگے۔ اور ہوتے ہوتے ایسا ہوا۔ کہ حضور صرف شام کے دسترخوان پہ شرکت فرمایا کرتے۔

مَیں قادیان میں رہنے لگا۔ قرآن شریف بھائی عبدالرحیم صاحب نے پڑھانا شروع کر دیا۔ اس کے علاوہ سیدنا حضرت اقدسؑ کی بعض کتب کا مطالعہ شروع کر دیا۔ جن میں سے سرمہ چشم آریہ سب سے پہلے میں نے پڑھی۔ جو مرزا ایوب بیگ صاحب مرحوم نے مجھے ایک حد تک پڑھائی اور سمجھائی۔ مرحوم مجھ سے بہت سلوک اور محبت کرتے تھے۔

قادیان کی پر لطف زندگی اور سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صحبت اور حضور کے چہرہ مبارک کی محبت نے میرے دل سے واپسی کے خیالات بالکل ہی نکال دیئے۔ اور میں نے اظہار اسلام کر کے باہر چلے جانے کی بجائے اسی زندگی کو ترجیح دے لی اور فیصلہ کر لیا۔ کہ اب جینا مرنا یہیں ہو تو خوشی ہے۔

میرا سامان جو بھی کچھ تھا۔ سیالکوٹ ہی میں رکھا تھا۔ میں نے چاہا۔ کہ ایک مرتبہ سیالکوٹ جاؤں۔ سامان بھی لے آؤں اور سید بشیر حیدر صاحب سے ملاقات بھی کر آؤں چنانچہ میں نے اسی نیت کا اظہار حضرت مولانا مولوی عبدالکریم صاحب مرحوم سے کر کے اجازت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ مگر حضرت مولوی صاحب نے بجائے اس کے میرے لئے اجازت حاصل کرتے خود ہی فرمایا۔ کہ "سیالکوٹ جانے کی ضرورت نہیں، سامان ہم یہیں منگا لیتے ہیں۔ اور بشیر حیدر بھی خود آ کر مل جائیگا۔"

"بہت اچھا جسطرح آپ فرماتے ہیں یہی ٹھیک ہے" یہ میرا جواب تھا۔ جس سے حضرت مولوی صاحب خوش ہوئے اور مجھے دعا دی۔ اور سامان کے واسطے اُسی روز خط لکھ دیا۔ جو نہیں معلوم کسی آنے والے کے ہاتھ یا پارسل ہو کر جلدی آگیا۔ اور مجھے مل گیا اس کے کچھ عرصہ بعد سید بشیر حیدر صاحب بھی آئے اور مل گئے۔

میں کچھ شرمیلا زیادہ تھا جس کی وجہ سے زیادہ میل جول کا عادی نہ تھا۔ تنہائی مجھے زیادہ اچھی لگتی۔ اسی وجہ سے میرا حلقۂ تعارف بہت محدود رہتا۔ اور جن سے کسی مناسبت کی وجہ سے تعلق ہو گیا۔ انہی کے ساتھ مل جل لیا کرتا تھا۔ نمازوں اور درس حضرت مولانا نورالدین صاحب میں باقاعدگی سے شریک ہوا کرتا اور سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی صحبت مسجد اور ہمرکابی سیر کو اپنی نہائت ہی مرغوب چیز یقین کرتا۔ نماز حضرت مولانا مولوی عبدالکریم صاحب پڑھایا کرتے۔ جن کی قرآن خوانی کا میں عاشق تھا۔ اُن کی قرأت میں ایسا سوز و گداز ہوا کرتا تھا۔ کہ رقت پیدا ہو جایا کرتی۔ صبح کی نماز کی قرأت سے غفلت کی نیند سونے والے جاگ اٹھا کرتے۔ اور جن کی نیند کو مؤذن کی اذان کھول نہ سکتی اس قرأت کی سُریلی آواز سے چونک کھڑے ہوا کرتے تھے۔

مجھے ٹھیک یاد نہیں دو اڑھائی یا تین مہینے کے قریب زمانہ قادیان میں رہتے ہوئے ہوگا۔ اور اگرچہ میری رہائش بالکل مسافرانہ تھی۔ کیونکہ کوئی گھر تھا نہ گھاٹ ایک الماری حضرت مولانا مولوی نورالدین صاحب کے مطب میں مجھے ملی ہوئی تھی۔ وہی میرا گھر تھا۔ تعلیم کا کوئی خاص انتظام نہ تھا اور خوراک و پوشاک اور دوسری ضروریات کا بھی خدائے واحد و یگانہ کے سوا کوئی کفیل نہ تھا۔ گھر سے یا بڑے چچا صاحب سے جو کچھ لایا تھا۔ ابھی اُسی پر گذارہ ہوتا تھا۔ مگر باوجود ان باتوں کے میرا دل اپنے وطن اور ماں باپ کے گھر سے زیادہ مطمئن اور بہت زیادہ خوش تھا۔ اور قادیان سے باہر جانے کا وہم بھی مجھے نہ آیا تھا۔

سکھوں میں تبلیغ کی طرف سیدنا حضرت اقدس علیہ السلام کی توجہ اس زمانہ میں خاص طور سے تھی۔ اور حضور ؑ کتاب "ست بچن" تصنیف فرما رہے تھے۔ جس کے واسطے مصالحہ جمع کرنے کیلئے سکھوں کی کتب کی چھان بین ہو رہی تھی۔ اور اسی ذیل میں حضور کو ڈیرہ بابا نانک چولا صاحب دیکھنے کی غرض سے جانا پڑا۔ اس زمانہ میں سواری یکوں ہی کی ہوا کرتی تھی۔ بڑی کوشش اور انتظام سے دو یا تین یکے تیار کرائے گئے۔ اور سفر کی تیاری ہوئی ساتھیوں کے نام تجویز ہونے لگے میرا نام بھی پیش ہوا۔ مگر حضور پاک نے فرمایا۔ "ان کے گاؤں کا قرب ہے ایسا نہ ہو کوئی رشتہ دار ان کو دیکھ کر پیچھے پڑ جائے اور ہمارے سفر کی غرض ہی فوت ہو جائے بہتر یہی ہے کہ وہ نہ جائیں۔"

چنانچہ اس طرح میں اس مبارک سفر میں ہمرکابی کے شرف سے محروم رہ گیا۔ بھائی عبدالرحیم صاحب ہمرکاب تھے۔

اس سفر سے واپسی پر سیدنا حضرت اقدسؑ بہت ہی خوش تھے۔ اور اس تبلیغی دریافت کا ذکر اس طرح مجلس میں فرمایا کرتے جس طرح کوئی دنیا دار کسی بھاری خزانہ کے حصول سے خوش ہو۔ چنانچہ اکثر ایسے ہی مسائل کا چرچہ ان دنوں ہوا کرتا تھا۔ اور قادیان کے دن اور رات، تنہائی اور مجالس تبلیغی جدوجہد اور روحانی خزائن کی دریافت و اشاعت کیلئے ہی وقف رہتے تھے۔

اُنہی زمانہ کا ذکر ہے۔ ایک رات (موسم سردی کا یاد پڑتا ہے کیونکہ مطب کے اندر سویا ہوا تھا۔ اور صبح کی اپنی کیفیت کے مدنظر بھی یہی اندازہ کرتا ہوں کہ خاص سردی کے ایام تھے) میں مطب میں سویا ہوا تھا۔ اور میرے قریب مرزا محمد اشرف صاحب افسر جائیداد (موجودہ سنہ ۱۹۳۸ء) کے والد بزرگوار مولوی جلال الدین صاحب مرحوم جو ایک نہائت ہی نیک دل، پاک نفس اور عبادت گذار انسان تھے۔ اور انہیں کی تبلیغ اور صحبت میں بھائی عبدالرحیم صاحب مسلمان ہوئے تھے۔ میرے قریب ہی ان کی چارپائی تھی۔ وہ چارپائی ہی پر نماز تہجد ادا کر رہے تھے اس رات اُسی وقت میں نے ایک منذر رویا دیکھی۔ جس کے اثر سے میں تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔ اور میری اس گھبراہٹ کا اثر ایسا ظاہر تھا۔

کہ مولوی صاحب مرحوم نے مجھ کو فرمایا "کیوں میاں عبدالرحمٰن! کیا بات ہے؟" میں نے اصل بات بتائے بغیر ہی عرض کیا۔ "خیر ہے۔ نماز کے لئے اٹھا ہوں"۔

"خواب میں مجھے دکھایا گیا۔ کہ ایک باریک لمبا سانپ میری طرف آرہا ہے۔ اور جب وہ میرے قریب آیا تو حضرت مولانا مولوی نورالدین رضی اللہ عنہ صاحب نے ایک لاٹھی اس کو ماری مگر وہ لاٹھی کے نیچے سے بالکل صفائی کے ساتھ زندہ نکل کر سیدھا میری طرف بڑھا۔ اور میرے جسم کے گرد لپٹ گیا۔" اس نظارہ اور سانپ کے میرے جسم کے گرد لپٹ جانے کی وجہ سے مجھ پر ایسی گھبراہٹ اور پریشانی وارد ہوئی۔ کہ میں نیند سے ایسا چونک کر اٹھا کہ مولوی صاحب موصوف نے بھی میری بیداری کو غیر معمولی گھبراہٹ زدہ محسوس کیا۔

اٹھا۔ استغفار کیا۔ اور وضو کر کے دو چار نفل پڑھے ہونگے۔ کہ صبح کی اذان ہوگئی۔ مسجد پہنچا۔ صبح کی نماز ادا کی۔ اور واپس آکر اپنا قرآن شریف جو کہ حضرت اقدس ؑ کے کتب خانہ میں پیرجی سراج الحق صاحب کے پاس (مطب کے شمالی مشرقی کونہ کی کوٹھڑی) رکھا تھا۔ لیکر اپنی چٹائی اٹھانے کو تھا۔ تا مطب کے اوپر چھت پر جاکر تلاوت کروں۔ کہ پیرجی سراج الحق صاحب نعمانی مجھ سے فرمانے لگے۔ "میاں عبدالرحمٰن! ہمارا ایک کام تو کردو۔ اور ساتھ ہی ایک منی آرڈر فارم اور کچھ روپے دیکر فرمایا۔ یہ منی آرڈر کرا آؤ۔" مجھے پیر صاحب کا یہ ارشاد اسوقت جبکہ میں تلاوت قرآن کریم کی غرض سے جارہا تھا۔ کچھ گراں اور ناگوار بھی گزرا مگر اس خیال سے کہ ایک بزرگ کے ارشاد کی تعمیل بھی تو نیکی ہے۔ قرآن شریف واپس اندر رکھ کر منی آرڈر کرانے بازار کو چلا گیا۔ اسوقت مجھے خوب یاد ہے۔ کہ میں نے ایک دوتہی اوڑھی ہوئی تھی۔ جس سے یقیناً سردی کا موسم معلوم ہوتا ہے۔

پوسٹ آفس اس زمانہ میں لالہ بڈھامل کی دو منزلہ دوکان کے نچلے حصہ میں ایک آریہ سکول ماسٹر مسمی سومراج کے ہاتھ میں ہؤا کرتا تھا۔ لالہ بڈھامل کی دو عمارتیں بالمقابل اونچی اونچی پہاڑی دروازہ کے قریب کھڑی ہیں۔ جو ریتی چھلا نام میدان کی طرف ہے۔ اور پوسٹ آفس مشرقی جانب کی دوکان میں تھا۔ اور صبح سویرے ہی سویرے سکول جانے سے پہلے وہ ماسٹر ڈاک روانہ کر دیا کرتا تھا۔

میں منی آرڈر کو لے کر جلد جلد ہندو بازار سے ہوتا ہؤا ڈاک خانہ کو گیا۔ تاکہ واپس آکر تلاوت کروں۔ مگر جب میں ڈاکخانہ پہنچا۔ اور اُس کے کھلے دروازہ کے سامنے کھڑا ہؤا۔ تو دیکھتا ہوں۔ کہ میرے والد صاحب اس آریہ ماسٹر کے پہلو میں بیٹھے ہیں۔ میں اس نظارہ سے جو اچانک پیش آیا۔ ایک سکتے کے عالم میں تھا۔ اور طبیعت نے ابھی فیصلہ نہ کیا تھا۔ کہ قدم آگے اٹھاؤں یا پیچھے کہ والد صاحب مجھے دیکھتے ہی کھڑے ہو کر میری طرف بڑھے۔ اور مجھ سے لپٹ گئے۔ چھاتی سے لگایا۔ اور پیار کیا۔ دلاسا دیا اور میری تسلی کے لئے فرمانے لگے "بیٹا! تم نے جو کچھ کیا اچھا کیا۔ جب تمہارے دل کو یہی بات پسند ہے۔ تو کون روک سکتا ہے۔ خوش رہو۔ اور جہاں چاہو رہو۔ مگر تم گھر سے آئے پھر اطلاع نہ دی ہم لوگ تمہاری تلاش میں سرگرداں پھرے سینکڑوں روپیہ برباد ہؤا۔ تمہاری ماں روتے روتے اندھی ہوگئی۔ اور تمہارے عزیز بھائی بہنیں جدائی کی وجہ سے بیتاب اور نیم جان ہیں۔ ایک مرتبہ چل کر ماں کو مل لو شائد اس کی بینائی بچ جائے۔ اور بھائی بہنوں کو پیار کر لو۔ کہ وہ تمہارے نام کو ترستے ہیں۔" وغیرہ وغیرہ

والد صاحب جیسا کہ شائد میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں۔ بہت ہوشیار الّسان تھے۔ اس زمانہ کے مناسب حال فارسی زبان اور اردو میں ان کو خاص مہارت تھی۔ اور بہت اچھے منشی بلکہ خوشنویس اور انشا پرداز بھی تھے۔ بعد کے حالات سے معلوم ہؤا۔ کہ والد صاحب قادیان میں ایک روز قبل کے آئے ہوئے تھے۔ اور مقامی ہندوؤں اور آریوں سے (جن میں سے سب سے زیادہ ڈپٹیوں کا گھرانہ جن کا مکان اُن دنوں اللہ پاک کی عجیب در عجیب قدرت نمائی کا نمونہ ہو کر صدر انجمن احمدیہ کے دفاتر کی صورت میں کھڑا ہے۔ اور یہی مدرس غالباً سومراج) مشورے اور منصوبے گانٹھتے رہے تھے۔ اور بعد میں مجھے معلوم ہؤا۔ کہ یہاں تک بھی فیصلہ کیا گیا تھا۔ کہ اگر اور کوئی صورت نہ بنی۔ تو رات کے اندھیرے میں سوتے کی چارپائی اٹھوا لائیں گے۔ کوئی ہمارا مقابلہ نہ کرسکیگا۔ میں اچانک والد صاحب کی گرفت میں آجانے کی وجہ سے ابھی پریشان اور بالکل خاموش تھا۔ چند منٹ بعد سنبھلا تو عرض کیا۔ چلیں حضرت صاحب کے ڈیرے کی طرف تشریف لے چلیں اور ساتھ ہی پوسٹماسٹر کو جلدی منی آرڈر کرنے کو کہا۔ مگر وہ ٹراشریر آدمی تھا۔ اُس نے موقعہ کو غنیمت سمجھ کر دوسرے کام شروع کر دیئے اور میرا منی آرڈر پیچھے اٹھا رکھا۔ اُس کی غرض یہ تھی۔ کہ میرے والد صاحب اچھی طرح سے باتیں کرلیں۔ کیونکہ عین ممکن تھا۔ کہ اس کے خیال کے مطابق میرے والد صاحب کو پھر مجھ سے اسطرح باتیں کرنے کا موقع نہ ملے۔

غرض اس طرح چند منٹ اور دیر ہوئی۔ اور میں والد صاحب کے پاس بیٹھا اُن کی باتیں خاموشی سے سنتا رہا اور والد صاحب بھی مصلحت وقت کے ماتحت اُس وقت نہائت ہی محبت شفقت اور ہمدردی کی باتیں کرتے رہے اور ایسے واقعات سناتے رہے۔ جن سے میرا دل پگھلے اور نرم ہو۔ اور والدہ اور بھائی بہنوں کی محبت میرے سینے میں جوش مار کر تازہ ہو۔

نہ معلوم کس طرح کسی اپنے یا بیگانے کے ذریعہ ہمارے ڈیرے میں یہ بات جا پہنچی۔ کہ وہ عبدالرحمٰن کو اس کے والد اور ہندوؤں نے پکڑ لیا ہے۔ اور ڈاکخانہ کے اندر روک رکھا ہے۔" یہ افواہ ڈیرے میں پہنچی اور فوراً ہی کسی نے اندر سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام تک بھی پہنچا دی جس کے سنتے ہی حضورؑ پاک فداہ روحی حرم سرا سے باہر تشریف لے آئے۔ اور نہ معلوم حضور کی اجازت سے یا خود بخود ہی جس دوست نے جو اُن دنوں قادیان میں موجود تھے سنا۔ ڈاک خانہ کو روانہ ہوگیا۔ اور ڈیرے سے ڈاکخانہ تک موجود الوقت بزرگان سلسلہ کا ایک تانتا بندھ گیا۔

اتنے میں پوسٹماسٹر نے بھی مجھے فارغ کر دیا تھا۔ اور میں نے والد صاحب کو حضرت اقدسؑ کی خدمت میں حاضر ہونے پر رضامند کر لیا تھا۔ چنانچہ والد صاحب کھڑے ہوئے تھے۔ اور میں بازار میں اتر چکا تھا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ حضرت نانا جان رضی اللہ عنہ صاحب مرحوم، پیرجی سراج الحق رضی اللہ عنہ صاحب نعمانی بھائی عبدالرحیم صاحب۔ بھائی عبدالعزیز صاحب اور اور بہت سے دوست جن کے اسماء اور اُن کا خیال مرور زمانہ کی وجہ سے ذہن سے اُتر گیا ہے۔ چلے آرہے ہیں۔ کوئی آگے ہے کوئی پیچھے کوئی تیز آرہا ہے۔ اور کوئی دوڑ کر۔ اس سچی محبّت، حقیقی اخلاص اور دلی ہمدردی کا اثر میرے قلب سے آجتک کبھی زائل نہیں ہؤا۔ جو اس واقعہ کی اطلاع سے ان بزرگوں میں میرے لئے پیدا ہؤا تھا۔

میں والد صاحب کو لیکر بازار سے ڈیرے کو روانہ ہؤا۔ میرے محسن مہربان شفیق اور دوست بھی میرے ساتھ ہی واپس لوٹے اور بازار کے ہندوؤں کو تو علم تھا ہی۔ وہ اس نظارہ کا معائنہ کرنے دوکانوں پر کھڑے ہو گئے۔ اور اس طرح ایک بھیڑ اس اُجڑے بازار میں نظر آنے لگی۔

مجھے اس بات کا علم نہیں کہ میرے واجب الاحترام بزرگ قابل عزت بھائی۔ اور مہربان دوست خود بخود میرے پکڑے جانے کی اطلاع پاکر میری طرف ڈاکخانہ کو روانہ ہو گئے تھے۔ یا کہ اُن کو سیدنا حضرت اقدس مسیح پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف سے کوئی حکم پہنچا تھا۔ جس کی تعمیل میں بڑے بڑے بزرگ مجھ ناکارہ و ناچیز کی امداد کو روانہ ہو گئے تھے۔ (مجھے ان بزرگوں میں سے بعض کے نام یاد نہیں رہے۔ پہلے چند نام لکھے ہیں۔ اُن میں مخدومی محترم حضرت حاجی حافظ حکیم فضل الدین صاحب مرحوم و مغفور کا نام نامی بھی قابل اندراج ہے)

مسجد مبارک کی کوچہ بندی سے نکلتے ہی میری نظر میرے آقائے نامدار فداہ روحی سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام پر پڑی جبکہ حضورؑ فصیل کی پلیٹ فارم پر ٹہل رہے تھے (آجکل احمدیہ چوک کے جانب شرق جو مکان حضرت اقدس کے موٹر گراج کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اور اُس سے قبل رتھ خانہ تھا۔ اور جس کے اوپر پیرجی سراج الحق صاحب کے مکان کا صحن واقعہ ہے۔ یہ جگہ پہلے پہل ۱۸۹۵ء میں ایک کھلے دالان کی صورت میں تھا۔ اور بعد میں اسمیں ضیاء الاسلام پریس سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حکم سے قائم کیا گیا۔ اس دالان کے جانب جنوب سے لے کر موجودہ مہمان خانہ تک (مہمان خانہ کی شکل بھی اب بدل چکی ہے۔ شرق کی جانب بھی وسیع ہوگیا ہے۔ اور جانب شمال بھی ایک دالان اور بڑھ گیا ہے۔ پہلے صرف پچھلی دو کوٹھڑیاں ہؤا کرتی تھیں۔) اصل ایک پلیٹ فارم تھا جو در اصل شکستہ شہر پناہ یا فصیل تھی۔

یہ پلیٹ فارم قریباً ۲۴ فٹ چوڑا اور ایک سو دس فٹ لمبا تھا) حضورؑ پاک کو دیکھ کر میرے دل میں جذبات محبت و شکر گذاری کا ایک سمندر موجزن ہوگیا۔ اور اس طرح اچانک پکڑے جانے کا جو صدمہ اور افسردگی میرے دل پر مستولی تھی۔ دور ہو کر بشاشت خوشی اور اطمینان مل گیا۔ اور میں نے والد صاحب کو دور ہی سے بتا دیا۔ کہ وہ ہمارے حضرتؑ صاحب ہیں۔

والد صاحب ہوشیار آدمی تھے۔ اشارہ پاتے ہی سنبھل گئے۔ اور نہائت مؤدبانہ و نیازمندانہ رفتار اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی جیب سے کچھ روپے نکال کر مٹھی میں لے لئے۔ قریب پہنچکر ہندوآنہ سلام کر کے نذرانہ پیش کیا حضورؑ نے سلام کا جواب تو دیا۔ مگر نذرانہ قبول نہ فرمایا۔ اور باوجود والد صاحب کے اصرار کے قبول کرنے سے انکار فرما دیا۔ حضورؑ نے نہائت شفقت اور مہربانی سے اوّل خیریت پوچھی۔ اور پھر آمد کا مقصد و غائت دریافت فرمائی۔ اور ایسے طریق سے حضورؑ نے کلام فرمایا۔ کہ میرے والد صاحب کا سہما ہؤا دل اور مرجھایا ہؤا چہرہ بشاش ہوگیا۔ اور اس طرح وہ کھُل کر عرض حال کرنے کے قابل ہوگئے۔ نہ معلوم اُن کے دل میں کیا کیا خیالات پیدا ہو رہے تھے۔ جبکہ وہ تنہا میرے ساتھ ہمارے ڈیرہ کی طرف آ رہے تھے۔ اور اُن کے حمائتی منصوبہ باز اور سازشی لوگوں میں سے کوئی بھی اُن کے ساتھ نہ ہؤا۔ بلکہ برخلاف اس کے وہ چاروں طرف میرے محسنوں، بزرگوں، دوستوں اور بھائیوں کا ہجوم دیکھتے آ رہے تھے۔ حضور کی محبت و شفقت اور نرمی و پاکیزہ اخلاق نے اُن کی کمر ہمت باندھ دی۔ اور اس طرح وہ آزادانہ طور پر اپنا مقصد اور دلی غرض و غائیت حضرت اقدسؑ کے حضور پیش کر سکے۔

قریباً نصف گھنٹہ تک حضورؑ نے اُن کے معروضات نہائت توجہ سے سُنے۔ اور دوران گفتگو میں حضورؑ اس پلیٹ فارم پر شمالاً جنوباً ٹہلتے رہے۔ کہیں کہیں حضورؑ اُن کی دلجوئی اور تسلّی کے لئے بعض ناصحانہ فقرات فرماتے اور بعض غلط خیالات کا ازالہ بھی فرماتے رہے جب میرے والد صاحب دل کھول کر سب کچھ عرض کر چکے۔ تو سیدنا حضرت اقدسؑ نے مجھے الگ لے جا کر پوچھا۔ ”میاں عبدالرحمٰن تمہاری کیا مرضی ہے؟“

چونکہ والد صاحب کے ساتھ میں بھی حضرتؑ کے ساتھ ساتھ ٹہلتا اور تمام باتیں سنتا رہا تھا۔ اور اُن کی غرض و غائت اور مقصود کا مجھے علم ہو چکا تھا۔ میں نے نہائت ادب سے حضرتؑ کے حضور عرض کیا۔

”حضور میں دل سے مسلمان ہوں۔ اور حضور کی غلامی کی سعادت اللہ پاک نے مجھے محض اپنے فضل سے بخشدی ہے۔ بے شک والدین اور بھائی بہنوں کی محبت میرے دل میں بیحد ہے۔ مگر میں ابھی جانا نہیں چاہتا۔ کیونکہ میں نے اسلام کے متعلق کچھ بھی نہیں سیکھا“

میری یہ عرض سنکر حضورؑ نے میرے والد صاحب کو بلا کر فرمایا:۔

”ہم ابھی عبدالرحمٰن کو آپ کے ساتھ نہیں بھیج سکتے۔ بہتر ہے۔ کہ آپ کو اگر فرصت ہو۔ تو ہفتہ دو ہفتہ ان کے پاس ٹھہریں۔ اور اگر آپ ملازمت کی وجہ سے نہ ٹھہر سکیں تو ان کی والدہ اور بھائی بہنوں کو یہاں بھیجدیں۔ وہ ان کے پاس جتنا عرصہ چاہیں ٹھہریں۔ اُن کی آمد و رفت اور بود و باش کے اخراجات ہمارے ذمہ ہونگے“

حضور یہ جواب دیکر اندر تشریف لے گئے۔ اور میں والد صاحب کو ساتھ لیکر سیدنا حضرت حکیم الامت مولانا مولوی نورالدین صاحب کے مطب میں جا بیٹھا جہاں اُن دنوں حضور کی کتاب ”ست بچن“ کی فرمہ شکنی اور مسل برداری ہو رہی تھی۔ والد صاحب کے دل پر حضور کے اس فیصلہ کی وجہ سے رنج و غم کا غلبہ تھا۔ اور اُن کی دلی مایوسی کا اثر اُن کے چہرہ سے نمایاں ہو رہا تھا۔ مگر میں خوش تھا۔ اور والد صاحب کو بھی خوش کرنا چاہتا تھا کبھی ست بچن میں سے بابا نانک صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حالات سے متعلق نظم پڑھ کر سناتا۔ کبھی کسی اور طریق سے اُن کی خدمت کر کے اُن کی دلجوئی کی کوشش کرتا۔ کچھ دیر بعد ایک ہندو آیا۔ اور کھانے کے لئے والد صاحب کو ساتھ لے گیا۔

سیدنا حضرت حکیم الامت مولانا مولوی نورالدین صاحبؓ کا مطب اس زمانہ میں یہی دالان تھا۔ جو موجودہ موٹر گیراج کے جانب شمال واقع ہے۔ مگر یہ مطب پہلے صرف ایک لمبے دالان کی صورت میں تھا۔ جس کے جانب شمال دو کوٹھڑیاں تھیں۔ جن کے دروازے جانب جنوب اُس دالان میں کھلتے تھے۔ شرقی کوٹھڑی میں سیدنا حضرت اقدسؑ مسیح پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کتب خانہ ہؤا کرتا تھا جس کے انچارج اُس زمانہ میں جس کا میں ذکر کر رہا ہوں حضرت پیرجی سراج الحق صاحب نعمانی تھے۔ اور دوسرے غربی جانب کی کوٹھڑی عموماً کھلی رہتی۔ اور مسافروں یا مہمانوں کے کام آیا کرتی تھی۔ آجکل اس دالان کے بیچوں بیچ ایک دیوار کھڑی کر کے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ جس کے غربی حصہ میں اندنوں بھی مولانا مولوی قطب الدین صاحب مطب کرتے ہیں۔ اس دالان کی دیواروں میں چند الماریاں ہؤا کرتی تھیں۔ جن میں طلباء قرآن و حدیث و طب یا بعض مستقل مہمان اپنا اپنا سامان ضروری رکھا کرتے تھے اس دالان کے بالائی حصہ پر آجکل پیرجی سراج الحق صاحب نعمانی کے مکان کا صحن ہے۔ اور شمالی جانب کی دونو کوٹھڑیوں کے اوپر دو کوٹھڑیاں بغرض رہائش برائے پیرجی سراج الحق صاحب نعمانی بنائی گئی تھیں۔ جو آجکل بھی موجود ہیں۔ یہ بالاخانہ سیدنا حضرت اقدس مسیح پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں حضور کے ایما کے ماتحت بعض صاحب توفیق مخلصین میں تحریک کر کے امدادی چندہ سے پیرجی سراج الحق صاحب نعمانی کی رہائش کی غرض سے بنایا گیا تھا۔ اور خود حضرت نے بھی بڑی رقم اس میں لگائی تھی

اُس مطب کے جانب غرب موجودہ گلی جانب مشرق ڈھاب (ایام برسات میں ڈھاب اس دالان مطب کی شرقی دیوار کے ساتھ آن ٹکرایا کرتی تھی۔ اور اکثر اندنوں سیدنا حضرت مولانا مولوی نورالدینؓ صاحب اور ہم لوگ بھی دروازہ میں بیٹھکر یا زیادہ سے زیادہ ایک سیڑھی اُتر کر وضو کر لیا کرتے تھے۔) جانب جنوب موجودہ موٹر خانہ جس کے پہلے دو دروازے مطب کی طرف کھلتے تھے۔ جو بعد میں پریس کی گڑگڑاہٹ سے بچنے کی خاطر حضرت مولوی صاحب کے حکم سے بند کر کے الماریوں میں تبدیل کر دیئے گئے تھے۔ اور جانب شمال دو کوٹھڑیاں جن میں سے ایک کتب خانہ اور دوسری کھلی بطور مسافر خانہ یا مہمان خانہ استعمال ہوتی تھی۔ غربی کوٹھڑی میں ایک کھڑکی جانب کوچہ شارع عام لگی ہوئی تھی۔ اور مشرقی کوٹھڑی میں جانب شرق ایک کھڑکی تھی۔ ان کوٹھڑیوں کے جانب شمال حضرت مولوی صاحبؓ کا پہلا رہائشی مکان واقعہ تھا۔ جس میں اندنوں مفتی فضل الرحمٰن صاحب بود و باش رکھتے ہیں۔ والد صاحب کے کھانے کو تشریف لے جانے کے بعد میں بھی کھانے وغیرہ سے فارغ ہوگیا۔ والد صاحب کی واپسی میں تاخیر ہوئی۔ دریافت سے معلوم ہؤا۔ کہ والد صاحب نے سیدنا حضرت اقدسؑ کا فیصلہ قادیان کے آریہ لوگوں کو بتایا جس کے متعلق صلاح مشورے اور منصوبے ہوتے رہے۔ اور اسی مصروفیت کے باعث جناب والد صاحب جلدی واپس تشریف نہ لا سکے۔

ظہر کی اذان ہو چکی یا ہونے والی تھی۔ میں مطب میں بیٹھا کتاب ”ست بچن“ کی مسل برداری کر رہا تھا۔ کہ ایک بچہ سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام کی طرف سے ایک رقعہ لایا۔ اور زبانی یہ پیغام دیا۔ کہ ”اپنے والد صاحب کے دستخطوں سے اس مضمون کی ایک نقل کروا کر ہمیں بھیجدو۔ اور تم اپنے والد صاحب کے ساتھ چلے جاؤ۔“

بچے کے مونہہ سے زبانی پیغام کے الفاظ نکلے اور میرے دل و دماغ میں بیٹھے۔ مگر میں ان الفاظ کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ دوبارہ اور سہ بارہ پوچھا۔ مگر بچے نے الفاظ ایسے رٹے ہوئے تھے۔ کہ تینوں مرتبہ وہی الفاظ اسی ترتیب سے دہراتا رہا۔ آخر میں نے حضور کا وہ فرمان کھول پڑھا۔ اور حقیقت مجھ پر آشکارا ہوئی۔ فرمان کا خلاصہ مطلب میرے اپنے الفاظ میں حسب ذیل تھا:۔

”میں فلاں ابن فلاں جو کہ میاں عبدالرحمٰن (نومسلم) سابق ہریش چندر کا والد ہوں۔ باقرار صالح پرمیشور کے نام کی قسم اٹھا کر جو کہ میرا پیدا کرنے والا ہے۔ اور جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ اس امر کا پختہ اقرار اور پکا وعدہ کرتا ہوں۔ کہ اپنے لڑکے عبدالرحمٰن سابق ہریش چندر کو دو ہفتہ کے لئے اپنے ساتھ وطن کو لے جاتا ہوں۔ تاکہ اس کی غمزدہ والدہ اور ننھے ننھے بھائی بہنوں کو جو اس کی جدائی کے صدمہ سے بے قرار اور جاں بلب ہیں ملا دوں۔ میں پرماتما کے نام کی

یہ بھی پیمان کرتا ہوں۔ کہ عزیز کو راستہ میں یا گھر لے جا کر کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچاؤنگا۔ اور دو ہفتہ کے بعد حسب وعدہ صحیح وسلامت قادیان واپس پہنچا دونگا۔ دستخط

ہہنہ گواندتہ مل موہن بقلم خود۔

میں نے اس مضمون کو پڑھا۔ اور بار بار پڑھا۔ حضرت اقدس کے پہلے فیصلہ پر میں خوش تھا۔ مگر اب مجھ پر اوداسی اور پژمردگی چھا گئی۔ اور دل میں طرح طرح کے وساوس پیدا ہونے لگے۔ جی میں آیا۔ کہ قبل اس کے کہ والد صاحب واپس آویں۔ اور اس فیصلہ کا اُن کو علم ہو۔ میں کسی طرف نکل جاؤں کیونکہ میں جانتا تھا۔ کہ والد صاحب مصلحت وقت کی وجہ سے نرم تھے۔ ورنہ وہ میرے اسلام کی وجہ سے مجھے سخت تکلیف میں ڈالیں گے۔ اور میرا یہ اندیشہ اس حد تک بڑھا ہؤا تھا۔ کہ شائد وہ مجھے زندہ ہی نہ چھوڑیں گے۔ اور اس خیال کی تائید میں میرے اپنے گھرانے کے بعض پرانے واقعات میرے سامنے آن موجود ہوئے۔ اور میں نے یقین کر لیا۔ کہ آج ایک بھاری امتحان اور کٹھن گھاٹی میری راہ میں سدِّ سکندری آن بنی ہے۔ جس سے سلامت نکل جانا میری طاقت سے بالکل باہر ہے۔ ایسے شکلات میں مجھے پہلے بھی خدا کی طرف جھکنے کی عادت تھی۔ مگر قادیان کی زندگی اور سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صحبت کی وجہ سے دعا کی اور زیادہ عادت ہو گئی تھی۔ آخر میں چند منٹ کے لئے تنہائی میں چلا گیا۔ اور خدا کے حضور جھک کر گڑگڑایا۔ اور اس سے امداد چاہی۔ جس کے نتیجہ میں میرا بیٹھتا ہؤا دل اور ٹوٹی ہوئی کمر قوی ہو گئے۔ اور خدا تعالیٰ نے مجھ پر ایک سکینت اور اطمینان نازل کر دیا۔ اور خدا کے مسیحؑ کے فرمان کی تعمیل کے لئے دل میں قوت وطاقت پیدا ہو گئی۔ اور میں نے فیصلہ کر لیا۔ کہ اپنے آقا کے حکم کی تعمیل کرونگا۔ خواہ جان بھی اس راہ میں کیوں نہ دینی پڑے میں یہ فیصلہ کر چکا تھا۔ کہ والد صاحب بھی تشریف لے آئے۔ میں نے ابھی تک کسی سے حضرت کے اس فیصلہ کا ذکر نہ کیا تھا۔ مگر پیغام لانے والے بچے کے ذریعہ سے یہ بات عام ہو چکی تھی۔ اور غالباً میرے والد صاحب کو بھی پہنچ چکی تھی۔ جو کہ قریب ہی ڈپٹی شنکر داس کے مکان پر مقیم تھے۔ کیونکہ والد صاحب جب کھانے سے واپس آئے میں نے اُن کے چہرہ کو زیادہ بشاش پایا۔ جس سے میں نے محسوس کیا۔ کہ غالباً اُن تک یہ فیصلہ پہنچ چکا ہے۔

میں نہیں جانتا۔ کہ سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پہلے فیصلہ کی تبدیلی کے کیا اسباب ہوئے۔ کسی انسان نے کوئی مشورہ دیا۔ یا خود خدائے پاک نے حضورؑ کو پہلے فیصلہ کی تنسیخ کا ایما والقا یا الہام فرمایا۔ میرا قیاس ہے۔ کہ آخرالذکر امر ہی اس فیصلہ کی تبدیلی کا موجب ہؤا ہوگا۔ کیونکہ حضورؑ نے پہلا فیصلہ حالات کے مطالعہ کے بعد ہی فرمایا تھا۔ اور وہ فیصلہ صاف اور ناطق تھا۔ کوئی شرط اس میں نہ تھی۔ اور نہ ہی شبہ کی کوئی گنجائش تھی۔ اور میرا ایمان مجھے اسی یقین کی طرف لے جاتا ہے۔ کہ خدا کے پیارے اور بزرگ نبی اپنے فیصلے خدا کے فرمان کے سوا بدلا نہیں کرتے۔ کیونکہ اُن کے فیصلے ہر وقت حق وحکمت اور عدل وانصاف پر مبنی ہؤا کرتے ہیں۔

بہرحال والد صاحب آئے۔ میں نے وہ فرمان اُن کو دیدیا جس کو پڑھ کر انہوں نے قلم دوات لی۔ اور قلم برداشتہ ایک بہت مضبوط معاہدہ لکھ کر دیدیا۔ جو سیدنا حضرت اقدسؑ کے الفاظ سے بھی کہیں زیادہ قوی اور حلف سے مؤکد تھا۔ والد صاحب نے بجائے پرمیشور کے نام کی سوگند کے الفاظ لکھنے کے شروع ہی ان الفاظ سے کیا۔ کہ

”میں فلاں ابن فلاں خدائے واحدہٗ لاشریک کے نام کی قسم اٹھا کر یہ اقرار کرتا ہوں، وغیرہ وغیرہ“

والد صاحب کی تحریر پختہ تھی۔ کیونکہ وہ خوشنویس اور پکے منشی تھے۔ فارسی زبان میں اُن کو خاص مہارت تھی جس کی وجہ سے مضمون نویسی اور انشا پردازی کا ملکہ اُن میں تھا۔ اُن کا تحریر کردہ معاہدہ سیدنا حضرت اقدسؑ کے حضور پہنچا۔ حضور نے ملاحظہ فرما کر محفوظ کر لیا۔ اور مجھے پھر حکم بھیجدیا۔ کہ

”تم اب اپنے والد صاحب کے ساتھ چلے جاؤ۔“

والد صاحب نے وہ معاہدہ سرِعام لکھا۔ جس کا علم تمام دوستوں کو ہو گیا۔ اور اب عام چرچا ہو گیا۔ کہ عبدالرحمٰن کو اس کے والد صاحب ساتھ لے جائیں گے۔ حضرت مولانا مولوی نورالدینؓ صاحب گھر میں تھے۔ اُن کو بھی اطلاع ہو گئی۔ حضورؑ کے اس فیصلہ کا اثر ہمارے ڈیرہ میں گونہ غم اور افسردگی کے رنگ میں اور ہندو بازار اور ہندو گھرانوں میں خوشی وشادمانی کی شکل میں ظاہر ہؤا۔ بعض دوستوں نے گھبراہٹ تک کا بھی اظہار کیا۔ اور اس فیصلے کو اپنی شکست سمجھ کر مغموم بھی ہوئے۔ مگر فیصلہ چونکہ سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا تھا۔ اس وجہ سے کسی کو مجال سخن نہ ہوئی۔ اور سب نے میرے ساتھ ملکر سرِ تسلیم خم کیا۔

ظہر کی نماز کے لئے سیدنا حضرت اقدس مسیح پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لائے۔ حضرت حکیم الامت مولانا مولوی نورالدینؓ صاحب اور حضرت مولانا مولوی عبدالکریمؓ صاحب بھی حاضر تھے۔ نماز ادا ہو چکی۔ اور حضور مسجد ہی میں تشریف فرما ہوئے۔ خاموشی کا عالم تھا۔ اور چاروں طرف ایک سناٹا چھایا ہؤا تھا۔ اور کسی قدر غیر معمولی طور سے حضورؑ پرنور بھی خاموش بیٹھے رہے حضرت مولانا مولوی نورالدینؓ صاحب اپنی عادت کے مطابق سر جھکائے ایک کونہ میں بیٹھے تھے۔ آپ کی عادت مبارک یہ تھی۔ کہ حضورؑ کی موجودگی میں بہت کم کلام فرماتے۔ اور حتی الوسع کلام میں ابتداء نہ فرماتے۔ مگر آج غیر معمولی طور پر اس مہر خاموشی وسکوت کو آپ ہی نے ان الفاظ سے جن میں ادب واحترام اور دربار نبوت کی شان کو خاص طور سے ملحوظ رکھا گیا تھا۔ یوں توڑا کہ:۔

”حضور نے بھائی عبدالرحمٰن کو ان کے والد صاحب کے ساتھ جانے کا حکم دیا ہے۔ جس علاقہ میں وہ جائینگے سکھوں اور غیر مسلموں سے گھرا ہؤا ہے۔ اور بہت دور ہے حضور اگر پسند فرمائیں۔ تو بھائی عبدالرحیم کو اُن کے ساتھ بھیجدیا جائے۔ تاکہ اُن کی خبر وخیریت اور حال واحوال تو پہنچتا رہے۔ اور ....“

حضرت مولوی صاحبؓ ابھی کچھ اور عرض کرنا چاہتے تھے۔ کہ حضورؑ پرنور نے مولوی صاحب کو یوں مخاطب فرمایا۔ اور اس وقت حضورؑ کا چہرہ مبارک سُرخ تھا۔ آواز میں ایک جلال شوکت اور رعب تھا۔

”نہیں مولوی صاحب ہمیں نام کے مسلمانوں کی ضرورت نہیں۔ اگر (”اگر“ کے لفظ کے متعلق مجھے شبہ ہے یقینی نہیں غالب خیال یہ ہے کہ ”ہمارا ہے تو آجائیگا“) ہمارا ہے تو آجائیگا۔ ورنہ کوڑا کرکٹ جمع کرنے سے کیا حاصل۔“

میں جن ایام میں قادیان پہنچا۔ اُس زمانہ میں حضورؑ پُرنور عموماً بہت لاغر ونحیف ہؤا کرتے تھے۔ حضورؑ کا چہرہ مبارک زرد رہتا تھا۔ چنانچہ پہلے روز میں حضور کو پہچان بھی نہ سکا۔ جب تک حضرت مولوی عبدالکریم صاحب مرحوم ومغفور نے مجھے یہ نہ بتایا۔ کہ حضرتؑ صاحب یہ ہیں۔ حضور کی صحت عام طور پر اس زمانہ میں زیادہ کمزور تھی۔ مگر جب کبھی بھی کوئی خاص بات کا موقعہ پیش آتا حضور کا چہرہ مبارک سُرخ لعل کی مانند دمکنے لگا کرتا تھا۔ اور ایسا معلوم ہؤا کرتا تھا۔ کہ حضورؑ سے بڑھکر شباب اور جوانی کسی پر آئی ہی نہیں۔

یہی رنگ آج کی صحبت میں دیکھنے میں آیا۔ حضرت مولوی صاحب جو پہلے ہی مراقبہ میں تھے۔ حضور کے اس فرمان کی وجہ سے اور بھی جھک گئے۔ اور ایک لفظ بھی نہ دہرایا۔ حضور پُرنور اُٹھے۔ اور اندر تشریف لے گئے مجھ غمزدہ کو اتنی بھی جرأت نہ ہوئی۔ کہ دست بوسی ہی کر لیتا۔

مجلس برخاست ہو گئی۔ اور سب لوگ اپنے اپنے قیام گاہ کو چلے گئے۔ جن سے میں مصافحہ کر سکا کر لیا۔ حضرت مولانا مولوی نورالدینؓ صاحب بھی اپنی حرم سرائے کو تشریف لے گئے۔ میں مسجد سے نیچے اُترا۔ والد صاحب میری انتظار میں کھڑے تھے۔ مجھے جلدی تیاری کا حکم دیا۔ اور فرمایا۔ کہ یکہ تیار ہے۔ یکے والا جلدی کر رہا ہے۔ تم جلدی کرو۔ اور حق بھی یہ ہے۔ کہ اب ان کو حق بھی پہنچتا تھا۔ کہ جو بھی فرماتے فرما سکتے تھے۔ کیونکہ فیصلہ اُن کے حق میں ہو چکا تھا۔

خدا نے مجھے ایک رویا دکھائی تھی۔ جو آج کے دن سے پہلی رات کے بعد سحری کے وقت ہوئی تھی۔ اس میں ایک حضرت مولانا مولوی نورالدینؓ صاحب کے متعلق بھی تھا۔ کہ انہوں نے ”اس سانپ کو جبکہ وہ میری طرف لپکا آرہا تھا۔ ایک لاٹھی رسید کی تھی۔ مگر اس لاٹھی کا سانپ پر کوئی اثر نہ ہؤا۔ اور وہ بچکر مجھ سے لپٹ گیا“!

میں سمجھتا ہوں۔ کہ حضرت مولانا رضؓ کی وہ لاٹھی یہی تھی۔ جو آپ نے حضرت اقدسؑ کے حضور بھائی عبدالرحیم صاحب کو میرے ساتھ بھجوانے کی تجویز کی صورت میں چلائی تھی۔ مگر غیر مؤثر ہو کر رہ گئی۔

میں نے جلد جلد اپنے چند پارچات اور قرآن کریم۔ حزب المقبول اور حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دو تین کتب جو میرے پاس تھیں باندھ لیں۔ اور بزرگوں دوستوں محسنوں بھائیوں اور رفیقوں سے وداعی سلام کرنے لگا۔ میں بہتوں سے ملا اور بہت سے مجھے ملنے کو تشریف لائے۔ آخر میں روانگی کے وقت اپنے محسن حضرت مولانا نور الدین رضؓ صاحب کے در دولت پر بھی حاضر ہوا۔ دروازہ پر آواز دی۔ سلام کیا۔ نام پوچھا گیا۔ اجازت ملی۔ اندر پہنچا دیکھتا کیا ہوں کہ حضرت مولانا رضؓ چارپائی پر لیٹے ہوئے ہیں۔ اور دو تین خادم حضور کو چاپی کر رہے ہیں۔ میں بڑھا جھکا اور سلام کیا۔ حضور نے لیٹے ہی لیٹے مجھے گلے سے لگا لیا۔ اور پھڑ پھڑاتے ہونٹوں سے بھرّائی ہوئی آواز کے ساتھ میرے لئے دعا سفر فرمائی۔ اور مجھے دلاسا دیکر نصیحت کی۔ اور اللہ حافظ کہا۔

میں اس نقشہ کو کبھی بھی نہیں بھول سکتا۔ اور آج پورے چالیس سال کے بعد جب میں اس واقعہ کو حوالہ کاغذ کر رہا ہوں۔ وہ نقشہ ہو بہو میرے سامنے موجود ہے۔ اور وہی تأثرات آج بھی میرے دل میں موجزن ہیں۔ ایسا کہ میں سمجھتا ہوں۔ کہ وہ واقعہ آج ہی ہوا۔ یا ہو رہا ہے یعنی مفتی فضل الرحمٰن صاحب والے موجودہ مکان کے دالان میں جس کے دو دروازے شمالی جانب صحن میں کھلتے تھے غربی جانب کے دروازہ کے اندر دروازہ کو چھوڑ کر دروازہ کے مشرقی جانب آپ کا پلنگ بچھا تھا۔ آپ رو بقبلہ لیٹے ہوئے تھے۔ سر مبارک شمال کی جانب تھا۔ میں نے محسوس کیا۔ جب کہ مجھے حضور نے گلے لگایا۔ کہ حضور کو شدید بخار تھا۔ اور غمخوری کی وجہ سے آواز میں بھرّاہٹ تھی گویا۔ کہ آپ بحالتِ کظیم تھے۔ آپ کی محبت اور شفقت سے میرے پیش آمدہ غم و درد کا پیمانہ چھلک پڑا۔ اور میں زار و قطار رونے لگا۔ اور یہی نہیں کہ میں رو پڑا۔ بلکہ میں نے دیکھا۔ اور اب بھی وہ نظارہ میرے سامنے ہے کہ حضرت مولانا مرحوم و مغفور بھی چشم پُر آب ہو رہے تھے۔

غرض ایسے ہی پُردرد اور جانگداز حالات میں سے گذرتا ہوا میں اپنے والد صاحب کے آگے لگ کر چل پڑا۔ جن کو میں اپنا عزرائیل بھی اگر ان حالات کی موجودگی میں کہوں۔ تو شائد گناہ نہ ہو۔ میں خدائے بزرگ و برتر سے ڈرتا ہوں۔ کہ والد صاحب کی گستاخی کرنے والا گردانا جا کر معصیت کا مرتکب سمجھا جاؤں۔ وہ میرے والد تھے میں اُن کا فرزند۔ مجھ پر اُن کے بے انتہا احسان ہیں اور مجھے پہلے سے بھی زیادہ اُن کا احترام کرنا چاہیئے اور کرتا ہوں۔ اُن کی زندگی میں بھی کیا۔ اور اب بھی دل میں ہے۔ کیونکہ اسلام نے مجھے یہی حکم دیا ہے۔ کہ ان کی زیادہ سے زیادہ فرمانبرداری کروں۔ اور اُن کیلئے اُف تک نہ کہوں۔ عزرائیل کا لفظ میں نے صرف واقعہ کی اصلیت اور اپنی تکلیف کے ثقل و سختی کی بنا پر استعمال کیا ہے۔

الغرض میں اپنے آقا، اپنے ہادی و راہنما، اپنے پیشواء و مقتداء کے حکم کی تعمیل میں اپنے والد صاحب کے ساتھ قادیان کی مقدس بستی سے رخصت ہو رہا ہوں۔ میرا دل غمگین اور اداس ہے۔ آنکھیں آنسو نہیں خون ٹپکا رہی ہیں۔ اور سچ سچ میں یہ سمجھ رہا ہوں۔ کہ گھر کو نہیں ماں اور بھائی بہنوں کی طرف نہیں بلکہ موت کے مونہہ میں دھکیلا جا رہا ہوں۔ میرے قدم لڑکھڑاتے ہیں۔ اور بجائے آگے اٹھنے کے پیچھے کو پڑتے ہیں۔ میرے دوست، میرے پیارے مجھے الوداع کہنے کو میرے ساتھ آ رہے ہیں۔ اور جہاں مجھے استقلال و استقامت کی تلقین فرماتے ہیں۔ میرے والد صاحب سے سفارش بھی کرتے ہیں۔ کہ اِن کو جلدی بھیج دینا۔ تکلیف نہ دینا۔ اور سوائے زبانی ہمدردی کے اور وہ بے چارے کر بھی کیا سکتے تھے والد صاحب اُن میں سے کسی کو یہ فرما دیتے۔ کہ اس نے مرغ پال رکھے ہیں۔ اُن کو ختم کر کے واپس آ جاوے کسی کو فرما دیتے۔ کہ ان کی والدہ روتے روتے اندھی ہو گئی ہے۔ ان کی آنکھوں کی روشنی کے لوٹتے ہی واپس آ جاوے۔ اور کسی سے کہتے۔ کہ اس کے پیارے بھائی بہن اس کی جدائی میں روتے روتے نڈھال ہیں۔ میں نے ان کو جاں بلب چھوڑا ہے۔ نہیں معلوم میری واپسی تک وہ زندہ بھی ہونگے یا نہیں۔ اگر وہ زندہ ہوں۔ تو اُن سے مل کر اُن کو دلاسا دیکر انکو چہرہ دکھا کر واپس آجاوے ورنہ اُن کی مڑھیاں ہی دیکھ آوے۔ تا ہمارے سینہ کی آگ تو ٹھنڈی پڑ جاوے۔ وغیرہ وغیرہ

خاکروبوں کے پنڈورہ تک جہاں اس زمانہ میں مرزا نظام الدین صاحب کا آموں کا باغ تھا۔ بہت سے دوست اور ہم عمر مجھے رخصت کرنے کو گئے۔ جہاں ایک یکّہ کھڑا تھا۔ اور بدقسمتی سے وہ بھی اجنبی تھا۔ غفارا کا ہوتا۔ تو شائد بٹالہ ہی سے کوئی پیغام اس کے ہاتھ بھیج سکتا۔ اس پر مجھے والد صاحب نے سوار کرایا اور خود بھی سوار ہوئے۔ اور اس طرح میں اس نہائت ہی پیاری بستی سے بادلِ ناخواستہ رخصت ہو گیا۔ آہ!

کسی مصلحتِ الٰہی کے ماتحت اس سلسلۂ تحریر میں تعویق ہوتی چلی گئی۔ اور گوناگوں مصروفیتوں مجبوریوں اور معذوریوں کے باعث ایک لمبے عرصہ تک باوجود خواہش کے وقفہ ہو گیا۔ اور کم بیش دو سال کے بعد آج اس سلسلہ کو شروع کرنے کی توفیق ملی ہے۔

اگرچہ اس التواء کے اسباب و علل ظاہری وہی ہیں۔ جو اوپر درج ہوئے مگر اس التواء و فترت کو حقیقتاً میری اس روحانی کشمکش۔ اضطراب اور بیقراری سے ایک باریک اور نہاں در نہاں مناسبت بھی ہے۔ جو قادیان سے باہر جانے کے وقت میرے دل میں پیدا ہوئی تھی جس کا بیان لفظوں میں ناممکن اور جس کا اظہار تحریر کی برداشت سے باہر ہے۔ اس قلبی کیفیت کو آشکارا کرنے سے قوتِ تخیل اور قوت بیان دونو عاجز و قاصر ہیں۔

مجھے اس بات کا بے حد افسوس اور رنج ہے۔ کہ میں وہ چیز دنیا کو دکھانے سے قاصر ہوں جس نے مجھے مہرِ مادری اور شفقتِ پدری اور حبِّ برادری تک بھلا دی میری جانثار ہمشیرہ (عزیزہ منظرا) میری حسین خاندانی ہمعمر بیوی اور میرے رفیق دوست معزز اور مہربان بزرگان خاندان جن کو اپنے خاندانی شرف اور شاندار روایات پر ہمیشہ فخر رہا ہے۔ مجھ سے چھڑا دیئے۔ میرا خاندان، میرا وطنِ عزیز اور میرا پیدائشی مذہب تک مجھ کو بھلا دیا۔ جس کی آواز دنیا میں آتے ہی میرے کان میں ڈالی گئی۔ اور جسکی تلقین متواتر پندرہ سال تک مجھے خاص توجہ کی جاتی رہی تھی۔ میں شرمندہ ہوں، اپنی کمزوری اور کم مائگی کا اقرار کرتا ہوں۔ اور مجھے اعتراف ہے۔ کہ مجھ سے حق شہادت ادا نہیں ہو سکتا جو میرے ذمہ ہے۔ اور اگر عمر بھر ببانگِ دہل نقارے کی چوٹ گلے میں دف ڈالے دیہہ بدیہہ، شہر بشہر اور کُو بکُو منادی بھی کرتا پھروں۔ تب بھی میرا ضمیر یہی کہیگا "حق تو یہ ہے۔ کہ حق ادا نہ ہوا۔"

جس زمانہ میں اللہ تعالےٰ نے محض اور محض اپنے فضل سے میرے سینہ کو نور اسلام سے منور کیا۔ میری آنکھوں کو بینائی بخشی۔ اور کفر و ضلالت، گمراہی و جہالت کے اتھاہ گڑھے سے نکال کر مجھے اوج سعادت پر پہنچایا۔ اور دولتِ ایمان سے مالا مال فرما کر نوازا بدقسمتی سے وہ زمانہ ایسا زمانہ تھا۔ کہ تبدیلئ مذہب کی وجوہات زن۔ زر یا زور کے سوا کچھ اور سمجھی ہی نہ جا سکتی تھیں۔ اور اظہارِ اسلام کرنے والے ہر کسی پر یہی شبہات کئے جاتے تھے۔ کہ (۱) کسی مسلمان عورت سے آشنائی ہو گئی ہوگی۔ (۲) یا کسی مُلّے نے دھوکہ دیکر سبز باغ دکھا کر اغواء کر لیا ہے۔ (۳) یا والدین کی سختی و بدسلوکی کے باعث اُن کے زور و شدت سے تنگ آ کر بھاگ نکلا ہوگا۔ وغیرہ۔ ورنہ مذہبی صداقت اور روحانی حقانیت سے متأثر ہو جانا۔ اور راستی کے آگے سرِ تسلیم خم کر کے دنیا و مافیہا کو خیرباد کہ دینا۔ اور بغیر کسی مادی طمع، دنیوی لالچ یا خوف و بیم کے خالصًا خدا کی رضاء کی تلاش و پیاس میں کسی کا نکلنا دنیا کے ماننے اور قبول کرنے میں آیا ہی نہ کرتا تھا۔

مگر میں علی رؤس الاشہاد یہ اعلان کر دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ اور اگرچہ میرے ماں اور باپ دونوں اس دنیا میں موجود نہیں۔ اُن کی مڑھیاں سنتی ہیں۔ کہ (۱) وہ میرے لئے نہائت ہی مہربان اور شفیق واقعہ ہوئے تھے۔ اور نہ صرف معمولی بلکہ غیر معمولی طور سے وہ مجھ پر مہربان تھے۔ اُن کا سلوک مجھ سے ہمیشہ کریمانہ تھا۔ اور اُن کو مجھ سے بالکل غیر معمولی محبت تھی۔ مجھے اُن کی زندگی میں اُن کے گھر کے اندر ہر قسم کی فارغ البالی اور کشائش و آزادی حاصل تھی۔ جو

اوسط درجہ کی زندگی سے نکل کر خوشحالی کا غالب رنگ اپنے اندر رکھتی تھی۔ یہی وجہ ہے۔ کہ بہرسہ اسلام کی خاطر گھر سے نکل آنے پر میرے والدین نے میری تلاش اور واپسی کی کوششوں میں ہزاروں روپیہ صرف کر دیا۔ اور جب دیکھا۔ کہ میں کسی رنگ میں بھی اس دولت ایمان کو ترک کرنے کیلئے تیار نہیں۔ تو ناچار اپنی ساری کوششوں کو چھوڑ کر ہتھیار ڈالدیئے۔ اور خود مہینوں میرے پاس آکر رہا کئے۔ جس سے ثابت ہے۔ کہ اُن کو جہاں مجھ سے نہائت درجہ محبت تھی۔ وہاں وہ میرے اظہار اسلام کی حقیقت اور صداقت کو بھی مان گئے تھے۔ اور جانتے تھے۔ کہ اس کیوجہ کوئی طمع یا خوف نہیں بلکہ خالص اور سچی روحانی پیاس تڑپ ہے

(۲) کبھی کسی مسلمان کو نہ صرف یہی کہ مجھے کسی رنگ میں تبلیغ کرنے کی توفیق نہ ملی۔ بلکہ اگر میں نے کسی سے استفادہ بھی کرنا چاہا۔ تو اُس نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا۔ یا پہلو تہی کی۔ کہ تمہارے رشتہ داروں سے ہمیں خوف آتا ہے۔

(۳) میں شادی شدہ تھا۔ میری بیاہتا میری ہم عمر اور خوش شکل ہونے کے علاوہ ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ اور اس کو مجھ سے گہرا تعلق تھا۔ اور وہ میرے پاس رہتی تھی۔

الغرض اللہ تعالےٰ کے فضل سے مجھے زمانہ کی بدمذاقی و بدشگونی سے بہمہ وجوہ نجات تھی۔ اور مجھے خدا تعالےٰ خالصتًا اپنی محبت کیلئے نوازا۔ اور دولت ایمان اور نور اسلام سے مالا مال فرمایا ہؤا تھا۔ اور میرے وجوہات اسلام خدا کے فضل سے نہائت پاک اور زرخالص کی طرح ہر قسم کی ملونی سے مبرّا تھے جسکی مجمل سی تشریح اوپر عرض کر چکا ہوں۔

ان حالات میں وہ کونسی طاقت تھی جس نے ایکطرف تو میرے تنے بھاری اور پختہ زنجیروں کو توڑ دیا۔ کہ نہائت ہی محسن اور شفیق والدین اور جان سے عزیز بھائی بہنوں اور گہرے دوستوں اور بزرگوں کی محبت کو مجھ پر ایسا سرد کر دیا۔ کہ نہ صرف اُن کی کوششوں ہی کو مجھے ٹھکرانا پڑا۔ بلکہ اُن کی منت وسماجت سے بھی بڑھکر التجا و لجاجت تک کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہؤا۔ اور میں نے اُن کے ساتھ جانے تک سے انکار کر دیا۔ دوسری طرف وہ کونسی آن، کونسا جذب اور کونسی قوت مقناطیسی تھی جس میں جکڑا گیا۔ جس کو باوجود صد ہزار کوشش میرے والدین توڑنے یا ڈھیلا کرنے تک سے بھی عاجز آگئے۔ افسوس میں وہ دنیا کو دکھا نہیں سکتا۔ کیونکہ وہ مادی نہیں۔

یہ سچ ہے۔ کہ قادیان پہنچنے سے قبل ہی بچپنے میں میرے دل میں تخم اسلام کاشت کر دیا گیا تھا۔ مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ اس کشتِ اسلام کی آبیاری و پرورش اگر اس ہادیٔ کامل اور باغبان روحانی کے ہاتھوں نہ ہوتی جس کو خدائے دوجہاں نے آخری زمانہ کا نبی و رسول کر کے بھیجا تھا۔ تو وہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکتی۔ اور میری کشتیٔ ایمان جو بحر ناپیدا کنار کی طوفانی موجوں کے بھنور میں پڑی ٹھوکریں کھاتی تھی۔ ہرگز کنارے نہ لگتی۔ اگر یہ نوح زماں ناخدا بن کر مجھے نہ بچا لیتا۔ میرے ایمان میں حلاوت پیدا ہوئی۔ تو اسی مرد خدا نما کے انفاس طیبہ کے طفیل سے اور مجھے روحانی زندگی ملی۔ تو محض اور محض اسی وجود باجود کی روحانی نفخ اور دم مسیحائی کی بدولت۔ ورنہ حق یہ ہے۔ کہ میں بھی محض ایک رسمی مسلمان ہو کر آخر کفر میں جذب ہو گیا ہوتا۔ کیونکہ اس وقت زندہ ایمان اور کہیں تھا ہی نہیں۔

پس میری نشأۃ اور حیات روحانی، میرا ایمان اور حلاوتِ ایمانی اُسی سرچشمۂ فیوض وبرکات سے ہوئی۔ جسے خدائے اسلام نے جان جہاں بنا کر اس مردہ دنیا کے لئے مسیحا بنا کے مبعوث فرمایا۔ اور جس کا جام زمانے کے مردوں کیلئے زندگی بخش جام بنا ؎

زندگی بخش جام احمدؐ ہے؛ کیا ہی پیارا یہ نام احمدؐ ہے

اس انسان کامل کے اوصافِ حمیدہ اور کمالات روحانیہ کا بیان ہزاروں صفحات اور عمر نوح چاہتا ہے۔ میں کون اور میری بساط کیا۔ کہ ان کا بیان کروں۔ وہ سراسر رحم اور مجسمۂ رحمت وہ پیکر حلم، خدا کی رحمت اور اُس کے حلم کا نمونہ تھا وہ ذاتِ والاصفات اپنے خالق و مالکِ حقیقی کی محبت میں کھویا ہؤا۔ اور اس کے رنگ میں ایسا رنگا گیا تھا۔ کہ خود مظہر صفاتِ الٰہیہ ہو گیا تھا۔ ہر قسم کا حسن اور خوبی اُس کی ذات پر ختم تھی۔ مہربانی میں ہر مادرِ مہربان سے اور شفقت میں ہر شفیق باپ سے وہ کہیں بڑھا ہؤا تھا۔ اتنا کہ مہربان سے مہربان مائیں اور شفیق سے شفیق باپ اس کی مہربانی، محبت و شفقت نے لاکھوں انسانوں کی یاد سے اتار دیئے۔

پس میرے آقا۔ میرے ہادی و راہنما کی قوت قدسی و جذب اور حضور پرنور کے اخلاقِ کریمانہ اور فیض روحانی نے میرے دل کی لوح پر وہ کچھ لکھدیا۔ جو پھر نہ مٹا اور خدا کرے کہ کبھی نہ مٹے۔ اور ایسا ہؤا۔ کہ میں دنیا کی بادشاہی پر اُس کے در کی گدائی کو عزت یقین کرنے لگا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس سے جدائی میرے واسطے ایک بھیانک موت نظر آ رہی تھی۔ اِسی وجہ سے دو سال ہوئے پکے کو خاکروبو کے پنڈارہ پر کھڑے کئے ہوئے ہوں۔ اور دل اس حق نما وجود اور اس کی مقدس بستی سے نکلنا پسند نہیں کرتا۔

میں جس زمانہ کے واقعات قلمبند کر رہا ہوں۔ اُس زمانہ میں قادیان ایک گمنام اور نہائت ہی مختصر سی بستی تھی جس میں زیادہ تر کچے اور خستہ حال مکانات اور بہت تھوڑی سی آبادی تھی۔ اندرون آبادی اراضی اور مکانات کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ اور بعض اوقات تو مفت کے برابر اراضی قیمت اٹھاتی تھی۔ مالکان مکان خواہش رکھتے تھے۔ کہ مفت میں ہی کوئی اُن کے مکان میں بود باش رکھے۔ بازار برائے نام تھا۔ کیونکہ کوئی کاروبار نہ تھا۔ اکثر محلے کھنڈر اور سنسان تھے۔

سیّدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ہاں کچھ رونق مستقل مہمانوں اور آنے جانے والے احباب کی رہتی تھی۔ مگر وہ بھی ایسی نہ تھی۔ کہ موجودہ زمانہ کی آبادی یا آنے جانے والے مہمانوں سے اُسے کوئی نسبت دی جا سکے۔ زیادہ سے زیادہ دس پندرہ یا بیس مستقل مہمان اور درویش لوگ تھے۔ اور مسجد مبارک باوجود اپنی پہلی تنگی کے ہم پر فراخ رہا کرتی تھی جس میں بارہا خدا کا اولوالعزم نبی جری اللہ فی حلل الانبیاء تن تنہا نماز کیلئے تشریف لے آیا کرتا تھا۔ اور بعض اوقات ایسا بھی ہؤا۔ کہ باوجود انتظار کے جب اور کوئی نہ پہنچا۔ تو حضورؑ نے کسی کو بلا کر اذان کہلوائی۔ بلکہ ایک مرتبہ تو مجھے یاد ہے۔ کہ حضورؑ نے خود بھی اذان کہی۔ حضورؑ کی آواز گو ہلکی تھی۔ مگر نہائت دلکش اور سُریلی آواز تھی جس میں لحن داؤدی کی جھلک اور گویا نفخ صُور کا سماں بندھ رہا تھا۔

نماز اس زمانہ میں حضرت مولانا مولوی عبدالکریم صاحب مرحوم سیالکوٹی پڑھایا کرتے تھے۔ اور جماعت کی صف اول دوسرے کمرہ میں کھڑی ہوتی تھی۔ جو اس وقت درمیانی حصہ تھا۔ سیدنا حضرت اقدس مسیح پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام بیت الفکر میں سے کھڑکی کے راستہ تشریف لایا کرتے اور کھڑکی سے ذرا آگے کو بڑھ کر دیوار کے ساتھ ہی یعنی صف اوّل کے بالکل دائیں جانب کھڑے ہو کر نماز ادا کیا کرتے تھے۔ اس زمانہ میں درمیانی کمرہ مسجد میں دو صفیں ہؤا کرتی تھیں۔ اور اسی طرح کمرہ سوم یعنی غسلخانہ سے مغربی جانب والے حصہ میں (جس میں نیچے سے اوپر آنے والی سیڑھی کھلا کرتی تھی) بھی دو ہی صفیں ہؤا کرتی تھیں۔ اور ہر صف میں معمولی پتلے دُبلے آدمی زیادہ سے زیادہ چھ اور بھاری بھر کم صرف چار کھڑے ہو سکتے تھے۔

نمازیں عموماً اوّل وقت میں ہو جایا کرتی تھیں۔ صبح کی نماز کا تو یہ عالم تھا۔ کہ ابھی اندھیرا ہی ہؤا کرتا تھا۔ کہ ختم بھی ہو جاتی تھی۔ بعض اوقات ایسا بھی ہؤا ہے کہ صبح کی اذان صبح ہونے سے قبل ہی ہو جاتی۔ اور نہ صرف یہی بلکہ نماز بھی ہو جایا کرتی تھی۔ اور بعد میں پتہ لگتا تھا۔ کہ ابھی تک صبح ظاہر نہیں ہوئی۔ مگر نماز کبھی دہرائی نہ گئی۔ چونکہ اذان ان دنوں عموماً حافظ معین الدین صاحب (حافظ معنا) کہا کرتے تھے۔ اور وہ آنکھوں سے معذور تھے۔

نماز تہجد کا اُن دنوں زیادہ التزام ہؤا کرتا تھا اور قریبًا سبھی لوگ نماز تہجد پڑھا کرتے تھے۔ تہجد کی نماز کے بعد لوگ اپنی اپنی جگہ دعا و استغفار میں مشغول رہتے حتٰی کہ اذان ہو جاتی تھی۔ اذان سنکر دو رکعت سنت بھی عموماً اپنے اپنے ڈیروں ہی پر پڑھکر مسجد میں آتے اور جماعت کی انتظار میں خاموش ذکر الٰہی میں مصروف رہتے تھے۔

تہجد اور نوافل کا اتنا چرچہ تھا۔ کہ اس کی وجہ سے کئی روز تک میں ایک غلطی کا مرتکب ہوتا رہا۔ وہ یہ کہ چونکہ صبح کی دو سنت عموماً دوست گھر میں ہی پڑھکر آتے تھے۔ میں باوجود اس علم کے کہ صبح کی نماز

دوسنت اور دو فرض پر مشتمل ہے۔ اس غلطی کا مرتکب رہا کہ صبح کی دو سنتیں نہ پڑھیں۔ آخر ایک روز جبکہ کوئی نئے مہمان آئے۔ اور وہ جماعت کھڑی میں شریک ہوئے جسکی وجہ سے پہلی دو سنت نہ پڑھ سکے۔ انہوں نے جماعت کے بعد دو سنت ادا کیں تو مجھے حیرت اور تعجب ہوا۔ کہ فرائض کے بعد صبح کی تو کوئی نماز نہیں۔ یہ دوست کیوں پڑھ رہے ہیں۔ اس پر مجھے کسی دوست نے بتایا۔ کہ صبح کی پہلی دو سنت ان سے رہ گئی تھیں۔ وہ ادا کر رہے ہیں تب جا کر مجھے ہوش آیا۔ اور میں سنبھلا۔ اور اپنی غلطی کا ازالہ کرنے لگا۔ ورنہ میں بھی تہجد کی نماز اپنی جگہ پر ادا کر لیا کرتا۔ مگر سُنن پہلے چند ایام خیال سے اتری ہی رہیں۔ نماز اشراک، ضحیٰ اور صلوٰۃ الاوابین کا بھی اس زمانہ میں خاصہ چرچا تھا۔

حضرت مولانا مولوی عبدالکریمؓ صاحب مرحوم کو اللہ تعالےٰ نے قرآن شریف سے ایک عشق عطا فرمایا تھا۔ اور نہائت خوش الحانی اور جوش سے قرآن پڑھا کرتے تھے۔ اُن کی آواز نہائت بلند مگر دلکش تھی۔ ایسا بھی ہوا کرتا تھا۔ کہ اُن کی قرأت سے بعض اوقات گہری نیند سوتے ہوئے دوست بیدار ہو جایا کرتے تھے۔

سیدنا حضرت مولانا مولوی نورالدین صاحبؓ بعض اوقات صبح صادق سے پہلے ہی گھر سے باہر آجایا کرتے۔ اور ہم لوگوں کو صبح صادق اور صبح کاذب میں امتیاز بتایا کرتے تھے۔ اور نجوم کے متعلق بھی بعض باتیں سمجھایا کرتے تھے۔ جن کے ذریعہ سے ہمیں رات کی اندھیری گھڑیوں میں وقت کا اندازہ کرنا آسان ہوتا تھا۔

مسجد مبارک جس میں سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام پنجوقتی نمازیں ادا فرماتے تھے اس زمانہ میں (۱۸۹۵ء) حسب ذیل شکل میں تھی۔

جانب غرب ایک چھوٹا سا حجرہ جو شمالاً جنوباً ۴ فٹ ۶ انچ (اندرون کے اندر اندر) اور شرقاً غرباً ۴ فٹ ۷ انچ (اندرون کے اندر اندر) تھا۔ اس حجرہ میں دو کھڑکیاں اور ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ ایک کھڑکی غربی دیوار میں تھی۔ جو آجکل بھی اپنی اصلی شکل میں موجود ہے۔ اور یہ اسوقت بھی اور اب بھی مرزا گل محمد صاحب کے مکان کی چھت پر کھلتی ہے۔ دوسری کھڑکی شمالی دیوار میں تھی۔ اور اب بھی کسی قدر تغیر کے ساتھ وہیں موجود ہے۔ فرق صرف یہ واقعہ ہوا ہے۔ کہ پہلے یہ کھڑکی گلی میں کھلتی تھی۔ اور اس کے سامنے کوئی روک نہ تھی۔ مگر آجکل (۱۹۳۴ء کے جلسہ کے قریب کے زمانہ سے) اس کو کسی قدر نیچا کر کے ایک راستہ کی شکل دیدی گئی ہے۔ اور سیدنا حضرت اقدس خلیفۃ المسیح ایدہ اللہ تعالیٰ کی آمد و رفت کا راستہ بنا دیا گیا ہے۔ اس وجہ سے اب وہ گلی میں نہیں کھلتی۔ بلکہ ایک بند گیلری میں کھل کر اندرون الدار جانے کا راستہ بناتی ہے۔ اور عموماً بند رہتی ہے۔ (صرف ایام جلسہ میں حضور اس راہ سے تشریف لاتے لیجاتے ہیں۔ یا کسی اور خاص ضرورت میں کام آتی ہے)

مسجد میں سے حجرہ میں داخلہ کا دروازہ بھی بالکل چھوٹا سا۔ بلکہ ایک کھڑکی ہی کے برابر تھا۔ نہ دروازہ کی طرح کھلا تھا نہ اونچا، جھک کر اندر داخل ہوا کرتے تھے۔ یہ دروازہ یا کھڑکی جو بھی نام رکھا جائے جنوبی کونہ میں تھا۔ اور شمالی کونہ میں اسطرح تھوڑی سی جگہ نکلتی تھی۔ اور یہی وہ جگہ ہے جہاں بعد میں سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام امام کے ساتھ کھڑے ہو کر نماز گزارا کرتے تھے۔ اسی حجرہ کی شرقی دیوار کے شرقی جانب یعنی مسجد مبارک کے حصہ اول کی طرف اوپر چھت کے قریب

من دخلہ کان آمنا

اِنَّ الدِّین عند اللّٰہِ الاسلام ومن یّبتغ غیر الاسلام دینًا
فلن یقبل منہ وھو فی الاٰخرۃ من الخاسرین
اللّٰھمّ صلّ علیٰ محمّدٍ وآل محمّدٍ وبارک وسلّم انّک حمیدٌ مجیدٌ
مُبارکٌ ومبارِکٌ وکلّ امرٍ مبارکٍ یُجعل فیہ

اور غالباً ربّنا اٰتنا فی الدّنیا حسنۃ وفی الاٰخرۃ حسنۃ وّقنا عذاب النّار لکھا ہوا تھا۔

دوسرا حصہ مسجد مبارک کا اُس حجرہ کی جانب شرق واقع تھا۔ اور حجرہ اور اس حصہ کو ایک دیوار جدا کرتی تھی۔ اس حصہ کا طول شرقاً غرباً ۹ فٹ ۱۱ انچ اور عرض شمالاً جنوباً ۷ فٹ ۱۱ انچ تھا۔ اس میں دو کھڑکیاں اور دو دروازے کھلتے تھے ایک تو وہی کھڑکی یا دروازہ جو حجرہ میں کھلتا تھا۔ اور دوسرا دروازہ مشرقی حصہ اور اس کی درمیانی دیوار میں تھا۔ ایک کھڑکی بیت الفکر میں سے مسجد مبارک کے اس حصہ میں کھلتی تھی جس میں سے سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام تشریف لایا کرتے تھے۔ اور یہ کھڑکی اسوقت تک (۳۶ء) اپنی اصلی شکل میں قائم ہے۔ اور یہ مسجد کی شمالی دیوار میں ہے۔ (بیت الفکر مسجد کے شمالی جانب واقعہ ہے) ایک کھڑکی جنوبی دیوار میں لگی ہوئی تھی۔ جو اُن ایام میں ایک ویران خراس کے کھنڈر کی طرف کھلتی تھی۔ جو مرزا نظام الدین وغیرہم کی ملکیت میں تھا۔ اور بعد میں (۱۹۰۶ء/۱۹۰۷ء) خرید کر حضور مسیح پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کو مسجد میں (اوپر کا حصہ اور نیچے دفاتر میں) تبدیل فرما دیا۔ مسجد مبارک کا یہی وہ حصہ ہے جس میں ابتداءً سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام صف اول میں کھڑے ہو کر صف کے بالکل دائیں جانب دیوار شمالی کے ساتھ لگ کر نماز باجماعت ادا فرمایا کرتے تھے یا حضورؑ کا دربار لگا کرتا تھا۔ میں نے بھی اُسی حصہ میں سب سے اول مرتبہ حضورؑ کی زیارت کا شرف حاصل کیا تھا۔ ان دنوں اس حصہ میں عموماً دو صفیں کھڑی ہوتی تھیں اور بعض ضرورتاً تین بھی کھڑی ہوتی رہی ہیں۔

مسجد مبارک کا تیسرا حصہ اس حصہ کے مشرقی جانب واقع تھا۔ اور ان دونوں حصوں کے درمیان میں ایک دیوار حائل تھی۔ اور ایک دروازہ جو قریباً درمیان میں تھا۔ اُن کو باہم ملاتا تھا۔ اس حصہ کا طول شرقاً غرباً ۹ فٹ ۴ انچ اور عرض شمالاً جنوباً ۷ فٹ ۵ انچ تھا۔ اور اس میں ایک کھڑکی جنوبی دیوار میں جو وہ بھی اسی ویران خراس کے کھنڈر میں کھلتی تھی۔ اور تین دروازے تھے جن میں سے ایک مسجد کے درمیانی حصہ میں کھلتا تھا۔ اور باقی دو میں سے ایک نیچے سے اوپر آنیوالی سیڑھیوں کا اور دوسرا وہ تھا جو غسل خانہ میں جاتا تھا جہاں اس زمانہ میں (۱۸۹۵ء) غسل اور وضو کیلئے پانی رکھا ہوتا تھا۔ یہی وہ حصہ ہے جس کو یہ عزت حاصل ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی قلم کی سُرخی کے نشانات عالم وجود میں نمودار ہو کر حضورؑ پُرنور کے کُرتے اور میاں عبداللہ صاحب سنوری مرحوم کی ٹوپی پر پڑے۔ اور ایک سیڑھی لکڑی کی بھی اس کے شرقی حصہ میں لگی ہوئی تھی۔ جو مسجد کے اُوپر جانے کیلئے گول کمرہ کی چھت پر کھلتی تھی۔ اور پھر گول کمرہ کی چھت سے دوسری سیڑھی کے ذریعہ اس غسلخانہ کی چھت پر جاتے تھے۔ اور چونکہ غسلخانہ کی چھت اصل مسجد سے نیچی تھی۔ لہٰذا ایک تیسری سیڑھی تھی جس کے ذریعہ سے مسجد میں پہنچتے تھے۔ مگر اب اسمیں تغیرات ہو چکے ہیں مسجد مبارک کے تیسرے حصہ کی آخری دیوار پر شرقی جانب یعنی غسلخانہ کی چھت سے اوپر جو حصہ دیوار تھا اس پر کشتی کی شکل بنی تھی۔ اور کچھ اور بھی لکھا تھا جسمیں سے ایک تو یہ

محمد عربی کابروئے ہر دو سراست
کسے کہ خاک درش نیست خاک برسر اوست

لکھا تھا۔

آجکل جو ایک دروازہ مسجد مبارک کے بالکل مشرقی حصہ میں الدار سے کھلتا ہے۔ یہ دروازہ پہلے نہ تھا۔ بعد میں کھولا گیا ہے پہلے زمانہ میں اس دروازہ کے اندر کے حصہ میں ایک لکڑی کی سیڑھی ہوا کرتی تھی جس کے ذریعہ سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اندرون خانہ سے مسجد مبارک کے بالائی حصہ میں تشریف لایا کرتے تھے۔ اس زمانہ میں جو دروازہ مسجد مبارک کی اصل چھوٹی سیڑھیوں سے اندرون الدار جانے کا تھا۔ وہ آجکل بند ہے اور موجودہ دروازہ اُسکی جا بجا کام دیتا ہے۔

سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نماز باجماعت کے علاوہ سنن و نوافل اندرون خانہ ادا کرتے تھے۔ پہلی سنتیں عموماً پڑھ کر گھر سے تشریف لاتے اور پچھلی سنتیں گھر میں تشریف لے جا کر ادا فرماتے تھے۔ البتہ ابتدائی زمانہ میں جبکہ حضور شام کی نماز کے بعد عشا کی نماز تک مسجد ہی میں تشریف فرمایا کرتے تھے۔ حضور شام کی نماز کی سنتیں مسجد ہی میں ادا کرتے تھے۔ دو سنت ادا فرماتے تھے جو ہلکی ہوتی تھیں۔ مگر سنوار کر پڑھی جاتی تھیں۔ کوئی جلدی یا تیزی اُن میں نہ ہوتی تھی۔ بلکہ ایک اطمینان ہوتا تھا۔ مگر وہ زیادہ لمبی نماز نہ ہوتی تھی۔ ان کے علاوہ بھی کبھی کبھار حضورؑ کو مسجد مبارک میں سنت ادا کرتے دیکھا۔ مگر ہمیشہ حضورؑ کی نماز آسان اور ہلکی ہوا کرتی تھی۔ چند مرتبہ حضورؑ کی اقتدا میں نماز باجماعت ادا کرنے کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔ مگر وہ نماز بھی حضور کی بہت ہی پُر لطف مگر ہمیشہ ہلکی ہی ہوا کرتی۔ ابتدا میں اکثر حضورؑ کے ساتھ لگ کر حضور کے پہلو بہ پہلو بھی نماز باجماعت ادا کرنے کا شرف ملا ہے اور اس کیلئے ابتدائی زمانہ ہی میں ہمیں خاص اہتمام کی ضرورت پڑا کرتی

اور ہم میں سے اکثر کی یہ خواہش ہوتی تھی۔ کہ حضور کے ساتھ مل کر کھڑے ہونے کی جگہ حاصل کریں۔

حضورؑ کو میں نے نماز میں کبھی رفع یدین کرتے نہیں دیکھا اور نہ ہی آمین بالجہر کرتے سنا۔ تشہد میں حضورؑ شہادت کی انگلی سے اشارہ ضرور کیا کرتے تھے۔ مگر میں نے کبھی نہ دیکھا کہ حضورؑ نے انگلی کو اکڑایا یا پھرایا ہو۔ صرف ہلکا سا اشارہ ہوتا تھا۔ جو عموماً ایک ہی مرتبہ اور بعض اوقات دو مرتبہ بھی ہوتا تھا۔ جو میرے خیال میں امام کے تشہد کو لمبا کرنے کی وجہ سے حضور کلمۂ شہادت دہراتے ہوئے کیا کرتے ہوں گے۔

حضورؑ نماز میں ہاتھ ہمیشہ سینہ پر باندھتے تھے۔ زیر ناف بلکہ ناف پر بھی میں نے کبھی حضورؑ کو ہاتھ باندھے نماز ادا کرتے نہیں دیکھا۔

حضورؑ پرنور خود امام نہ بنا کرتے تھے۔ بلکہ حضرت مولوی عبدالکریم صاحب مرحوم ومغفور کو حضورؑ نے نمازوں کی امامت کا منصب عطا فرمایا ہوا تھا۔ نماز جمعہ بھی حضور خود نہ پڑھاتے تھے۔ بلکہ عموماً مولوی صاحب موصوف ہی پڑھاتے تھے اور شاذ و نادر حضرت خلیفۂ اول رضی اللہ تعالےٰ عنہ پڑھایا کرتے تھے۔ اور کبھی کبھی حضرت مولوی سید محمد احسن صاحب امروہی بھی پڑھاتے تھے۔ ایک زمانہ میں دو جگہ جمعہ کی نماز ہوتی تھی۔ مسجد اقصیٰ میں بھی جو کہ جامع مسجد ہے اور مسجد مبارک میں بھی۔ مگر دونو جگہ امام الصلوٰۃ حضورؑ نہ ہوتے تھے۔ عیدین کی نماز بھی سوائے شاذ کے حضورؑ خود نہ پڑھاتے تھے۔ نماز جنازہ عموماً حضور خود پڑھاتے تھے۔ اور حضورؑ کو میں نے نماز جنازہ کسی کے پیچھے پڑھتے نہیں دیکھا۔ یا کم از کم میری یاد میں نہیں حضورؑ کی عادت مبارک تھی۔ کہ صبح کی نماز کے بعد کچھ دن نکلے سیر کے واسطے تشریف لے جایا کرتے تھے۔ اور سیر میں جانے سے پہلے حضرت مولوی صاحب خلیفہ اولؓ کو بھی اطلاع کرا دیا کرتے تھے۔ تاکہ وہ بھی ساتھ ہوں۔ بعض اوقات اُن کی انتظار بھی فرمایا کرتے تھے۔ اور ان کو ساتھ لے کر جایا کرتے تھے۔ ابتداء میں حضور بٹالہ کی سڑک کی طرف سیر کے لئے تشریف لے جاتے تھے۔ اور کم از کم موڑ تک جاتے تھے۔ گاہ گاہ موڑ سے آگے بٹالہ کی جانب بھی تشریف لے جاتے تھے۔ ایک دو مرتبہ نہر تک جانا بھی حضور کا مجھے یاد ہے۔

اس کے علاوہ میں حضور کے ہمرکاب جانب شرق قادر آباد (نیا گاؤں) کی طرف سے بسراواں کی طرف اور قادر آباد (نیا گاؤں) سے شمالی جانب کے راستہ سے جو قادر آباد (نیا گاؤں) اور بھینی کے درمیان سے جاتا ہے۔ اس راستہ پر بھی سیر کو گیا ہوں۔ چند مرتبہ ننگل باغباناں کی جانب بھی حضور سیر کے واسطے تشریف لے گئے ہیں۔ اور کاہلواں تک سیر فرمائی ہے۔

حضورؑ قادیان سے شمال کی جانب موضع بوٹر کی طرف بھی سیر کے واسطے تشریف لیجایا کرتے تھے۔ اور بعض دفعہ حضورؑ اپنے باغ کی طرف جو شہر سے جانب جنوب واقع ہے۔ بھی سیر کے واسطے گئے ہیں۔ باغ سے آگے لیلاں کی طرف ایک راستہ جاتا ہے۔ اس طرف کو اور بعض اوقات حضورؑ باغ ہی میں ٹھہر کر سیر فرماتے اور بعض پھل منگا کر خدام کو کھلاتے۔ اور خود بھی شریک ہوا کرتے تھے خصوصاً شہتوت، بیدانہ اور آم۔

کبھی کبھی حضورؑ کمر میں ایک پٹکا بھی باندھا کرتے تھے۔ ہاتھ میں حضور کے چھڑی ضرور ہوا کرتی تھی۔ جو عموماً موٹے بید کی اور کھونٹی دار ہوا کرتی تھی۔

حضورؑ کوٹ پہنے بغیر سیر کے واسطے کبھی تشریف نہیں لے جاتے تھے۔ جوتی حضورؑ کی ہمیشہ دیسی ہوتی تھی بوٹ میں نے کبھی حضورؑ کو پہنے نہیں دیکھا۔ ایک دفعہ ایک گرگابی کسی نے حضورؑ کے واسطے بھیجی یا پیش کی تھی۔ مگر اُس کے الٹے سیدھے کا حضورؑ کو خیال نہ رہتا تھا۔ اور اس وجہ سے حضورؑ کو تکلیف ہوتی تھی۔ آخر چھوڑ دی تھی۔

حضورؑ سیر میں تشریف لے جاتے۔ تو حضورؑ کے ہمرکاب اکثر مقامی دوست اور مہمان ضرور ہوا کرتے تھے حضور سیر میں بھی دینی باتیں فرمایا کرتے تھے۔ بعض اوقات نئی تصانیف کے مضامین باتوں باتوں میں سنا دیا کرتے تھے۔ دوستوں کے سوالات کے جواب بھی دیا کرتے تھے۔ اور اس طرح جاتے اور آتے سارا وقت اسی قسم کی گفتگو میں خرچ ہوا کرتا تھا۔ اور یہ ایک قسم کا شاندار دربار رواں کا نقشہ ہوا کرتا تھا۔ حضرت خلیفۂ اولؓ چلنے میں کمزور تھے حضورؑ پرنور کی رفتار تیز تھی۔ مگر تیزی نظر نہ آتی تھی۔ بلکہ ایک وقار اور سنجیدگی لئے ہوئے ہوا کرتی تھی۔ حضرت مولوی صاحب لوگوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھے ہوئے ہوئے چلا کرتے تھے۔ اور اکثر حضورؑ کے پیچھے رہ جاتے تھے۔ حضورؑ کو معلوم ہوتا۔ تو حضورؑ ان کی انتظار میں ٹھہر جایا کرتے تھے۔

حضرت خلیفہ اولؓ ہی پر کیا منحصر ہے۔ اور بھی بعض دوست حضورؑ کے ساتھ اور حضورؑ کی باتیں سننے کی غرض سے بجائے چلنے کے دوڑ دوڑ کر ساتھ ہوا کرتے تھے۔

چند مرتبہ جانب شمال کی سیر سے واپسی پر حضورؑ بازار میں سے بھی معہ خدام گذرے ہیں جب حضورؑ بازار میں سے گذرتے تو دوکاندار کیا ہندو اور کیا سکھ سبھی حضور کے لئے ادب سے کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔ اور کوئی کوئی سلام بھی کیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ حضورؑ اڈہ خانہ والے بازار میں سے بھی گذرے تھے اس وقت حضورؑ کے ساتھ خدام کی بھاری تعداد تھی۔ اور چونکہ وہ بازار ڈھلوان ہے۔ لہذا وہ نظارہ نہائت ہی شاندار اور دلکش تھا۔

ایک موقعہ پر غالباً جلسہ کے ایام تھے۔ بوٹر کی طرف حضورؑ سیر کے واسطے تشریف لے گئے۔ تو حضورؑ کے ساتھ بڑی بھیڑ تھی۔ گرد و غبار بہت اڑتا تھا۔ چلنا دشوار ہو گیا۔ حضورؑ تھوڑی دور جا کر کھلے کھیتوں میں (میدانی شکل تھی فصل نہ تھی) ٹھہر گئے۔ اور اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر بعض دوستوں نے الگ الگ حضورؑ کی خدمت میں حاضر ہونا شروع کیا۔ اُس دن قادیان سے شمالی جانب ایک بہت بڑی چھاؤنی کا نظارہ تھا۔

ایک زمانہ ایسا بھی آیا تھا۔ کہ حضور مردوں کیساتھ سیر کرنے کو تشریف نہ لے جاتے تھے۔ بلکہ صرف مستورات ہی حضورؑ کے ہمرکاب جایا کرتی تھیں۔ سیدۃ النساء حضرت ام المومنین ہمرکاب ہوتیں۔ اور شاہزادگان بھی۔ بعض خدام مستورات بھی جایا کرتی تھیں۔ مگر یہ سیر زیادہ تر بسراواں کی طرف قادر آباد (نیا گاؤں) سے آگے نکل کر اونچی زمین (دبرا) تک ہوا کرتی تھی۔

ایک مرتبہ حضورؑ بیگمات اور خادمات کے ساتھ باغ میں تشریف فرما تھے۔ غالباً عصر کے بعد کا وقت تھا باغ میں حضور سیدۃ النساء حضرت ام المومنین کے ساتھ ٹہلتے پھرتے تھے۔ کہ یکایک حضورؑ نے آسمان کی طرف دیکھ کر فرمایا" جلدی کرو۔ چلو واپس گھر چلیں۔ سخت اندھیری اور بادل آرہا ہے۔ سیدۃ النساء حضرت ام المومنین نے عرض کیا۔ کہاں ہے بادل اور کہاں کی اندھیری کچھ بھی نظر نہیں آرہا۔ اتنے میں ایک چھوٹی سی بدلی آسمان پر نمودار ہوئی۔ اور حضورؑ نے سیدۃ النساء حضرت ام المومنین رضی اللہ عنہا کو دکھا کر پھر جلدی واپسی کو کہا۔

مستورات باغ میں ادھر اُدھر پھیلی ہوئی تھیں۔ اُن کے اکٹھا ہونے میں دیر لگی۔ ادھر باد و باراں کا ایک طوفان عظیم سامنے آگیا۔ اور ابھی حضورؑ خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب والے باغ ہی میں تھے۔ کہ سخت بارش اور دن کو رات بنا دینے والی آندھی آن پہنچی۔ سیدۃ النساء حضرت ام المومنین کا ہاتھ حضورؑ پرنور نے پکڑ رکھا تھا۔ اور اُن کو لئے آرہے تھے۔ بارش کے باعث کپڑے شرابور ہو رہے تھے۔ سب سے آگے حضورؑ پرنور تھے اور پیچھے متفرق متفرق دوسری عورتیں تھیں۔

چونکہ ہم لوگوں کو معلوم تھا۔ کہ حضورؑ بیگمات کیساتھ سیر کے لئے باغ کی طرف تشریف لے گئے ہوئے ہیں۔ لہذا جس کسی سے ہو سکا۔ حضورؑ کو لینے کیلئے باغ کی طرف بڑھے۔ مدرسہ کے لڑکے بھی اس کام کے واسطے دوڑے۔

جب میں حضورؑ کے قریب پہنچا۔ تو حضورؑ نے فرمایا۔ ہم تو اب اللہ کے فضل سے آن پہنچے ہیں۔ پیچھے عورتیں بہت متفرق ہیں۔ اور خطرہ ہے۔ کہ کوئی اندھیرے کی وجہ سے ڈھاب میں نہ گر جائے۔ اُن کی مدد کرو۔ چنانچہ ہم سے جو کچھ ہو سکا۔ مستورات کی اس پریشانی میں ان کی خدمت کی کوشش کی۔ عورتوں کو بہت پریشانی ہوئی۔ بعض کے برقعے اُڑ گئے۔ زیور گر گئے۔ راستہ بھول گئیں۔

میں نے حضورؑ پرنور اور سیدۃ النساء حضرت ام المومنین کو اس جگہ واپس آتے دیکھا تھا۔ جہاں آجکل مرزا محمد اشرف صاحب کا مکان واقعہ ہے۔

حضرت نانی اماں بھی اس طوفان میں گھر گئی تھیں جن کو لیکر میری اہلیہ والدہ عزیز عبدالقادر راہ بھول گئیں۔ اور کھیتوں میں نکل گئیں۔ اور جب اجالا ہؤا۔ تو مولوی غلام رسول صاحب افغان والے مکان کے راستہ سے ڈھاب اور کھیتوں میں ہوتے ہوئے گھر لائیں۔ گھر لا کر اُن کو کپڑے بدلوائے بستر دیکر گرم کیا۔ اور جو کچھ ہو سکا خدمت کی۔ ادھر گھر میں اُن کی تلاش شروع ہوئی۔ باہر نہ ملیں۔ تو گھروں سے معلوم کرنا شروع کیا۔ آخر معلوم ہؤا۔ کہ قادیانی کے گھر میں بخیریت ہیں۔ مگر یہ واقعہ بہت بعد کا ہے۔

یکہ بان گھبرا رہا تھا۔ اور گھوڑے کے چارہ دانہ اور مقام ٹھکانہ کے مدنظر جلدی چلنے کا تقاضا کرتا تھا "اندھیرا ہو جائیگا۔ تو راہ چلنا دشوار ہوگا۔ رات ہو جائیگی تو چارہ دانہ بھی نہ ملے گا۔ اور گھوڑا منزل مارنے کے بعد بھوکا مریگا۔" وہ ایسی ہی باتیں بار بار دہراتا تھا۔

دوسری طرف والد محترم بھی اپنے بعض خاص خیالات کی وجہ سے اس کی پُرزور تائید فرما رہے تھے۔ کیونکہ ان کی مصلحتوں کا بھی یہی تقاضا تھا۔ کہ جسقدر جلد قادیان کی حدود سے مجھے باہر لے جائیں۔ اتنا ہی اُن کو اپنی کامیابی اور حصولِ مقصد کے لئے ضروری معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ وہ بھی مجھے جلدی چلنے کو بار بار فرماتے تھے۔ اگرچہ لب ولہجہ ان کا نہائت پُرحکمت اور تلطف آمیز تھا۔ مگر ان کے دل کی گہرائیوں میں جو خیالات موجزن تھے۔ اور جس کشمکش اور گھمسان کا تلاطم ان کے دماغ میں اس وقت پیدا ہو رہا تھا۔ وہ اتنا زور دار تھا۔ کہ اس کا انعکاس میرے دل و دماغ کو بھی ضرور متأثر کر رہا تھا۔ اور میرا دل و دماغ بھی ان باتوں کو محسوس کر رہا تھا۔ اور آنے والا خطرہ اپنی بھیانک شکل میں متمثل ہو کر میرے سامنے کھڑا ہو کر میری راہ روک رہا تھا۔ اور تعجب نہیں کہ میرے محسن بزرگ اور دوست جو نہائت محبت سے مجھے الوداع کہنے کو آئے ہوئے تھے۔ اِسی اثر سے متأثر ہو کر غیر معمولی محبت اور ہمدردی کا اظہار فرما رہے تھے اور بار بار کبھی مجھ سے اور کبھی میرے والد بزرگوار سے جلد آجانے یا جلد بھیجدینے اور شفقت و مہربانی کے سلوک کی تاکید کرتے تھے۔ جس کے جواب میں میری چشم پُرنم اور والد محترم کے حکیمانہ وعدے اور تسلی آمیز فقرات اُن کے خطرہ کے احساس کو اور بھی تیز کر رہے تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ یہ بے موقعہ صحبت بھی بہت لمبی ہوئی جاتی تھی۔ میرا دل بلیّوں اچھل رہا تھا۔ اور خیالات میں ایک قسم کا تلاطم بپا تھا۔ دل میں بار بار جوش اٹھتا۔ کہ اب بھی ہمت کر کے بھاگ کھڑا ہو۔ تجھے کوئی پکڑ تو سکے گا نہیں۔ چار دن اِدھر اُدھر گزار لے پھر سے انہی گلی کوچوں میں آجانا۔ والد محترم آخر ملازم سرکار ہیں۔ کب تک پیچھا کریں گے۔ مگر ایسے خیالات کے ساتھ ہی میرے محسن و محبوب آقا کے فرمان کی یاد بیچ میں آ کر ایک سدِ سکندری کھڑی کر دیتی تھی۔ جس کے حسن و احسان نے مجھکو نہ نظر آنے والے زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا۔ اور جس کی شفقت و مروّت نے مجھے ایسا گرویدہ کر لیا تھا۔ کہ اُس سے دُوری موت نظر آتی تھی۔ جس کی نگاہِ ناز مردہ روح میں زندگی پیدا کر دیتی تھی اور جس کی چشمِ نیم وا اندھوں کو بینائی بخشتی تھی جس کا جذب اس کے آستانہ پر گرنے والوں کو اُسی کا بنا دیتا تھا۔ اور جس کی صحبت دنیا جہاں کی صحبتوں کو بدمزہ اور بے لطف بنا دیتی تھی جس کا کلام روح پرور اور جس کی ہر ادا زندگی بخش تھی۔ اس کا حکم اور سچ پچ اسی کا فرمان تھا۔ کہ جسے میں نہ صرف یہ کہ توڑ نہ سکتا تھا۔ بلکہ اس تلخ پیالہ، اِس زہر آلودہ پیالہ کے پی جانے پر آمادہ و کمربستہ کر رہا تھا۔ مجھے آنے والے خطرہ کا احساس تھا۔ اور قادیان سے جانا مجھے موت کے مونہہ میں جانا معلوم دیتا تھا۔ مگر حضورؓ پرنور کے ارشاد کی تعمیل میں اس موت کا قبول کرنا میرے لئے آسان ہو جاتا تھا۔ اور میں اپنے خیالات کو دل سے نکال کر جی کو کڑا کر کے بھاگ کھڑا ہونے کے وہم کو دھتکار دیتا تھا۔

اِسی کشمکش اور خیالات کی جنگ کے دوران میں اللہ اکبر۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر۔ اللہ اکبر کی پرہیبت مگر سُریلی صدا اٹھی اور اُس نے اُس جنگ کا خاتمہ کر دیا۔ حق کی فتح ہو گئی۔ اور شیطانی لشکر مغلوب ہو گیا۔ میرا دل خدا نے مضبوط کیا مجھے تسلی دی۔ اور اطمینان بخشا۔ شیطانی وساوس پاش پاش ہوئے۔ اور میں اپنے آقا و امام کے حکم کی تعمیل میں اپنے والد صاحب کے ساتھ ہو لیا۔ دوستوں نے پھر سے ایک مرتبہ میرے والد صاحب سے میرے جلد واپس بھیجدینے کی سفارش کی جس کے جواب میں والد صاحب نے آخری فقرہ یہ کہا۔ کہ "وہ اپنے پالے ہوئے مرغ ختم کر کے واپس آجائیگا۔"

میں یکہ کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا۔ اور الٹا بیٹھا تاکہ نظر قادیان کی طرف رہے۔ یکہ جلد جلد چلنے لگا۔ نہ معلوم والد صاحب کو کیا خیال آیا مجھے پچھلی سیٹ سے آگے اٹھا کر خود میری جگہ بیٹھ گئے۔ اور یکہ بان کو جلد چلانے کا حکم دیا۔ سڑک کا موڑ آیا۔ نہر آئی۔ وڈالہ بھی نکل گیا۔ مگر یکہ نہ ٹھہرا۔ آخر دیوانی وال کا تکیہ آگیا۔ والد صاحب نہ چاہتے تھے۔ کہ یکہ ٹھہرے۔ مگر گھوڑا تکان محسوس کرنے لگا۔ اور عصر کی نماز کا وقت بھی تنگ ہونے کو آیا تھا۔ گھوڑا کچھ تو تھکان کے باعث، کچھ عادتاً رُک گیا۔ میں نے غنیمت جان کر چھلانگ لگا دی۔ نیچے اُترا اور تکیہ کے کنوئیں سے پانی لیکر وضو کیا۔ اور نماز عصر کیلئے اپنے ربّ کے حضور کھڑا ہو گیا۔ نماز گذاری۔ اللہ کے حضور عرض حال کیا۔ پیش آمدہ حالات کے مدنظر دعائیں مانگیں۔ اور فارغ ہو کر اٹھا ہی تھا۔ کہ پھر وہی "جلدی" کرنیکا حکم ملا۔ تعمیلِ ارشاد کی اور یکہ بان گھوڑے کو تیزی سے ہانکنے لگا۔ شام قریب تھی گھوڑا کمزور ہو رہا تھا۔ ابھی ساڑھے تین میل باقی تھے۔ چلتے چلتے شام ہو گئی۔ اور بٹالہ پہنچتے پہنچتے خاصہ اندھیرا چھا گیا تھا۔

بٹالہ پہنچکر والد صاحب نے یہی مناسب سمجھا۔ کہ کسی علیحدہ جگہ رات گذاریں۔ لہذا بٹالہ منڈی کی قدیم سرائے جو آجکل (۱۹۳۵-۳۶ء) میونسپل کمیٹی کا دفتر ہے۔ اور تحصیل کی عمارت کے جانب جنوب بٹالہ قادیان کی سڑک کے جنوبی کنارے پر واقعہ ہے۔ اور جس کے چاروں کونوں پر چار گول بُرج اور بڑا شاندار بلند و بالا دروازہ شمالی جانب بنا ہؤا ہے۔ اور اُس عمارت کے جنوب میں ایک وسیع تالاب واقعہ ہے۔ جو آجکل (۱۹۳۵-۳۶ء) پانی سے خالی اور خشک ہے۔ پہلے زمانہ میں عموماً بھرا رہتا تھا۔ قیام پذیر ہوئے۔ یہ جگہ اس زمانہ میں سرائے کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔

والد صاحب نے پہلے تو یکہ بان کو گھوڑے کے چارہ دانہ کا انتظام کرنے کو بھیجا۔ اور جب وہ فارغ ہو کر آگیا۔ تو اُس کو میرے پاس ٹھہرا کر خود کھانے وغیرہ کے انتظام کو تشریف لے گئے۔ والد صاحب نے اسی یکہ بان کے ساتھ آگے چلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اور چونکہ اس سے کچھ تعارف ہو چکا تھا۔ کچھ طمع دے کر اپنے مطلب کا بنا لیا۔ وہ گو مسلمان تھا۔ مگر اتنا غریب تھا۔ کہ چند پیسے کے طمع پر سبھی کچھ کرنے کو حاضر تھا۔ اس وقفہ میں مَیں نے نماز شام اور عشاء ادا کی۔ اور والد صاحب کی واپسی تک اس فرض سے فارغ ہؤا۔ والد صاحب کھانا لائے۔ خود دکان پر ہی فارغ ہو آئے تھے۔ مجھے کھلایا۔ اور کھانے سے فارغ ہو کر ہم لوگ سو رہے۔ رات کا پچھلا پہرہ تھا۔ کہ عادتاً میری آنکھ کھل گئی۔ اور میں اپنی چارپائی پر ہی بیٹھا ذکر میں مشغول ہؤا۔ آہٹ پا کر والد صاحب بھی چونک پڑے اور گھبرا کر مجھے پکارا۔ مگر میری آواز سنکر مطمئن ہو گئے۔ ہوش سنبھالے اور وقت کا اندازہ کر کے یکہ بان کو تیاری کا حکم دیا۔

میں نہ سمجھا کہ والد صاحب کس خیال میں ہیں۔ اور کیوں یکہ بان کو تیاری کا حکم دیا ہے۔ جبکہ بٹالہ سے گاڑی ملتی ہے۔ تو کیوں گاڑی چھوڑ کر یکہ کو پسند کیا جا رہا ہے۔ مگر مصلحتاً میں بھی خاموش رہا۔ اور قدرت کے کھیل کو دیدہ حسرت سے دیکھا کیا۔ جب یکہ بان تیار ہو گیا پھر روانگی کا حکم ملا۔ سوار ہو کر کسی نامعلوم جانب کو روانہ ہوئے۔ چونکہ ابھی رات کا اندھیرا تھا۔ اور میں ان راستوں سے بھی ناآشنا تھا۔ لہذا باوجود کوشش کے نہ سمجھ سکا۔ کہ کدھر جا رہے ہیں۔ آخر چند میل کا سفر طے کرنے کے بعد مشرق میں صبح کی سفیدی نمودار ہوئی۔ اور اُجالا ہونے لگا۔ مجھے صبح کی نماز کی فکر دامنگیر ہوئی۔ اور جوں جوں اجالا بڑھتا گیا۔ میری گھبراہٹ میں اضافہ ہونے لگا۔ اور لب سڑک ایک چلتا کنواں دیکھ کر مجھ سے نہ رہا گیا۔ اور والد محترم کی خدمت میں یکہ کو ٹھہرانے کی درخواست کر ہی دی۔ جو منظور کر لی گئی۔ یکہ روک لیا گیا۔ میں خوشی سے اُترا۔ جلد جلد وضو کیا اور صبح کی نماز اسی کنوئیں کے پاس ادا کر کے شکر خداوند ادا کیا۔

اب اچھا اُجالا ہو چکا تھا۔ سڑک کنارے لگے ہوئے میلوں کے نشانات سے معلوم ہؤا۔ کہ جس سڑک پر ہم لوگ سفر کر رہے ہیں۔ ڈیرہ بابا نانک کو جاتی ہے۔ اور اس سے میں نے اندازہ یہ کیا۔ کہ والد صاحب قبلہ نے احتیاطاً سیدھا راستہ چھوڑ کر چکر لگایا ہے۔ اور میں نے یہی نتیجہ نکالا۔ کہ والد صاحب محترم کو ابھی تک یہ خطرہ باقی تھا۔ کہ مبادا کوئی تعاقب کر کے مجھے اُن کے ہاتھ سے چھڑانے کی کوشش کرے۔ اور اسی وجہ سے انہوں نے امرتسر کا راستہ اور ریل کی سواری چھوڑی تھی۔ اور کہ اب وہ مجھے ڈیرہ بابا نانک سے سیالکوٹ اور وہاں سے وزیر آباد لے جائیں گے۔ جہاں سے انہی دنوں میں ریلوے لائین موجودہ لائل پور کی طرف نکل رہی تھی۔ اور چھکڑے وغیرہ سانگلاہل تک چلنے لگے تھے۔

چلتے چلتے ڈیرہ بابا نانک آیا۔ راستہ چھوڑ کر ایک طرف ہو کے یکہ ٹھہرایا گیا۔ گھوڑے کی مالش چاپی ہوئی۔ نہاری وغیرہ دیکر اُسے تازہ دم کیا گیا۔ اور خود ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر آگے کو روانہ ہوئے۔ راستہ میں دریائے راوی پڑتا تھا۔ پتن اور بیڑی کا راستہ تھا۔ اور چونکہ یہ علاقہ ہمارا وطن تھا۔ لہذا کچھ زیادہ احتیاط اختیار کی جانے لگی اور وضع قطع میں تغیر کے علاوہ راستہ کتر کتر کر چلنے کی کوشش کی گئی۔ تاکہ کنجروڑ وغیرہ اپنے دیہات کیطرف سے آنے والے واقف کاروں کے سوال و جواب سے بچاؤ ہو سکے۔ دریا پر پہنچکر ایسی کوشش کی گئی۔ کہ دریا سے اس پار کی سواریاں لانے والی کشتی سے پہلے ہی پہلے دوسری ناؤ میں بیٹھ کر نکل جائیں۔ چنانچہ ایسا ہؤا۔ کہ اُدھر سے آنے والی کشتی اِدھر کو آ رہی تھی۔ اور ہماری ناؤ اُدھر کو جا رہی تھی۔ اور اس طرح کسی واقف کار سے سامنا ہؤا نہ کسی نے جانا پہچانا۔ اور ہم لوگ دوسرے کنارے جا لگے۔ ہمارے دیہات سے آنے والے لوگ عموماً پہلی ناؤ سے آیا کرتے۔ اور آخری کشتی سے واپس چلے جایا کرتے تھے۔ اور اُن دنوں میں ہمارے اُس علاقہ کا تجارتی مرکز ڈیرہ بابا نانک تھا۔

دریا پار ہو کر پھر یکہ جلد جلد چلنے لگا۔ اور دس بجے کے قریب ہم لوگ دیرم دتّاں کے برابر تھے۔ جہاں کے ایک شریف زمیندار وت گھرانے کی دامادی کی مجھے عزت تھی۔ اور طبعاً ان تعلقات کے مدِنظر میرے جذبات میں ایک قسم کا تموّج تھا۔ اور میں خونی رشتہ کی وجہ سے خون میں ایک غیر معمولی حرکت پاتا تھا۔ مگر ہاں میرا خیال یہی تھا۔ کہ والد صاحب بزرگوار بحالتِ موجودہ اس بستی کا رُخ نہ کریں گے۔ بلکہ باہر ہی باہر سیدھے کنجروڑ دتّاں کو جائیں گے۔ جہاں ہمارے مکانات اور رشتہ ددھیال تھا۔ اور جو دیرم سے کم و بیش دو میل کے فاصلہ پر بسنتر ندی کے کنارے بہت ہی بلند و بالا اونچی اور شاندار عمارات کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اور ہماری برادری کی شاندار روایات اور اُن کے عروج و اقبال کی یاد تازہ کرتا ہؤا دکھائی دیتا تھا۔ اور جس کے سرسبز اور خوبصورت باغات قصبہ کی رونق کو دوبالا کر رہے تھے۔

مگر میری امید اور خیال کے بالکل برعکس والد صاحب محترم نے یکہ کا رُخ دیرم میرے سسرال کی طرف پھیرا دیا۔ اور گاؤں کے ایک چوگان میں پہنچکر ڈیرے ڈالدیئے۔ وہاں پہنچکر مجھے بڑی شفقت اور نرمی سے فرمایا۔ کہ یہاں تمہارے سسرال ہیں۔ اور ہماری برادری ہے۔ نماز پڑھنی ہو تو کہیں تنہائی میں جا کر پڑھ لینا۔ اور اپنے اسلام کی کسی کو خبر نہ ہونے دینا۔ ورنہ ہماری بے حد ذلت ہو گی۔ اور ہم جہاں برادری میں مونہہ دکھانے کے لائق نہ رہیں گے۔ وہاں جس مقصد کو لے کر آئے ہیں وہ بھی حاصل نہ ہو گا۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ تمہاری بیاہتا کو میں ساتھ لے جانے کی کوشش کرتا ہوں۔

خطرات اگرچہ میرے دل میں پہلے ہی موجود تھے۔ اور میرا دل آنیوالے مشکلات سے بے خبر نہ تھا۔ مگر اس پیغام سے جس میں اگرچہ شفقت کے ساتھ ساتھ نرمی بلکہ لجاجت کا غالب رنگ پایا جاتا تھا۔ میں نے اُن مشکلات کی بُو سونگھ لی۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ اور میں نے ایک مرتبہ پھر اس قید و بند سے نجات پا جانے کی ٹھان لی۔ اور میرے خیالات میں پھر سے ایک خطرناک جنگ چھڑ گئی۔ ایک طرف آنیوالے مشکلات کا خیال تھا۔ تو دوسری طرف ایک زبردست قوت اور نہ مغلوب ہونے والی طاقت تھی جو بہرحال یہ تلقین کرتی تھی۔ کہ بھاگ کر جاؤ گے کہاں؟ ایسا کرنے سے تم اپنے آقا کے نافرمان کہلاؤ گے۔ قادیان سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جاؤ گے۔ بہتری اسی میں ہے۔ کہ تعمیل ارشاد کرو۔ اور اس راہ میں آنے والے مشکلات کا مقابلہ کرو۔ تمہارے امام ہمام نے ایک باقاعدہ تحریری معاہدہ لے کر تمہیں والد صاحب کے ساتھ جانے کا حکم دیا ہے۔ اس حکم کی خلاف ورزی کر کے کس مونہہ سے واپس جاؤ گے اور اپنے آقا کو کیا عذر سناؤ گے؟ وغیرہ۔

انہی خیالات میں لیٹے لیٹے آنکھ لگ گئی۔ نیند کا غلبہ ہو گیا۔ اور ایسا سویا کہ دوپہر بعد جب آنکھ کھلی۔ تو میرے عزیز اور بزرگ میرے سرہانے تھے۔ ملے جلے اور شکوے شکایات کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ کھانے کا تقاضا شروع ہونے لگا۔ مگر میں نے طبیعت کی خرابی کا عذر کر کے ٹال دیا۔ اور گھر تک گیا۔ نہ کھانا کھایا۔ والد صاحب محترم نے بھی اس موقعہ پر میری خوب مدد کی۔ اور عزیزوں کو دوسری طرف متوجہ کر دیا۔ اور ایسی حکمت سے کام کیا۔ کہ میرے سسرال باوجود رسوم کے سخت پابند ہونے اور نام و نمود اور ذات برادری کی قیود کے بہت ہی چھوٹے نوٹس پر اپنی لڑکی کو روانہ کر دینے پر رضامند ہو گئے۔ اور ان کی یہ مصروفیت میرے لئے سوچنے اور غور کرنے میں غیبی تائید ثابت ہوئی۔ میں ڈیرے سے اٹھا اور گاؤں کے جنوبی جانب ایک گھنی سایہ دار درختوں کی جھنگی میں پہنچا۔ پانی پاس ہی تھا۔ وضو کر کے نمازیں ادا کیں۔ اور خدا سے مدد طلب کی کہ میں اس مشکل میں خود کوئی فیصلہ کرنے کی قابلیت نہیں رکھتا۔ میں نہیں جانتا۔ کہ میرے لئے ان حالات میں راہِ صواب کیا ہے۔ اپنی رحمت سے میری دستگیری فرما کر راہ نمائی فرمائیں۔ تاکہ میں کسی غلط قدم کی وجہ سے ہلاکت و تباہی کے گڑھے میں نہ جا پڑوں۔ میرے مولا خود میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنی رضاء کی راہ پر قائم کر دیجیئے۔ آمین

دعا کا دروازہ اگرچہ بچپن ہی سے اللہ کریم نے محض اپنے فضل سے میرے لئے کھول رکھا تھا۔ اور مجھے دعاؤں کی عادت تھی۔ اور اسی راہ سے اللہ کریم کی رحمت کے دروازے میرے لئے کھولے گئے تھے۔ اور اسی راہ سے مجھ ناکارہ کو الٰہ العٰلمین نے کفر و ضلالت کے تاریک ترین اتھاہ گڑھے سے نکال کر اس عروج سعادت پر پہنچایا۔ کہ سیدنا حضرت اقدس مسیح موعودؑ مہدی معہودؑ جری اللہ فی حلل الانبیاء کے قدوم میمنت لزوم میں لا ڈالا جس کے لئے صدیوں سے لاکھوں نہیں کروڑوں بزرگ ترستے ہی چلے گئے۔ اور نہ صرف یہی کہ اس نور مجسم کو دیکھ لینے کی سعادت ملی۔ بلکہ اس سے فیض پانے اور منوّر ہونے کے لئے اس کی صحبت پاک اور انفاس طیّبہ اور توجہات کریمانہ کا مورد بننے کا بھی شرف حاصل ہؤا۔

اِن فیوض و برکات بے انتہا اور لاتعد و لاتحصیٰ میں سے ایک دعا کا خزانہ ہے۔ جو بالکل نئی تجلّی نئے علم اور نئی معرفت، نئی حقیقت اور نئے یقین کے رنگ میں مجھے اس بزرگ و مقدس اور کامل و اکمل انسان کی صحبت سے نصیب ہؤا۔ حالت یہ تھی۔ کہ پہلے جسے میں نور یقین کئے ہوئے تھا۔ اب ظلمت محض نظر آتی تھی۔ اور جسے میں زر خالص سمجھکر اپنے سینے سے لگائے پھرتا تھا۔ موجودہ معرفت کے مقابل میں ایک کھوٹا پیسہ معلوم دیتا تھا اور وہ چیز جسے میں ایک بے بہا ہیرا سمجھکر پھولا نہ سماتا تھا۔ اب اس نور کے مقابل میں محض ایک پتھر بن کر رہ گیا تھا۔ دعا اور اس کا فلسفہ، دعا اور اس کے لوازم، دعا اور اس کی قبولیت کے شرائط اور گُر حضور کی صحبت سے فیض پانے والوں کے دلوں میں حضور کی "صبح کی سیر" اور "شام کے دربار" اور دوسرے اوقات کی صحبتوں سے ایسے نقش ہو جاتے تھے۔ کہ دنیا جہان کے خزانے اس نعمت پر قربان کئے جا سکتے ہیں۔

دیرم دتّاں کی سرزمین میں یکہ و تنہا۔ بے یار و مددگار میں مشکلات کی خطرناک تیر بازی کا نشانہ بنا ہؤا اپنے لئے کوئی مفر نہ پا کر دستگیری اور راہنمائی کے لئے آستانہ الوہیت پر گر جاتا ہوں۔ اپنے آقا اور آقا کے آقا کے نام کے واسطے (اوّل و آخر دعا کے درود شریف) سے خدا کی مدد کا طالب ہوتا ہوں۔ کہ اے حی و قیوم خداوند اے بے آسروں کے آسرے اور بے سہاروں کے سہارے تو خود میری مدد کو آ اور غیب سے میرے لئے قدرت نمائی فرما اور مجھے اس راہ پر قائم کر دے۔ جس میں تیری رضا ہو۔ الخ

میں آستانۂ الوہیت سے سر نہیں اٹھاتا۔ کہ آسمان سے ایک نور اُترتا اور مجھ پر سکینت ڈال جاتا ہے۔ جس سے میرا دل و دماغ منوّر ہو کر مجھے غیر معمولی طاقت و قوت مل جاتی ہے۔ ایسی کہ اس سے پہاڑ ٹل جائیں اور سمندر ساکن ہو کر رہ جائیں۔ اب مجھے کوئی خوف باقی رہا تھا۔ نہ خطرہ بلکہ ایک مضبوط چٹان کی طرح قوی عزم اور غالب حزم عطا کر دیا گیا تھا۔ اور ایسی لذت اور سرور محسوس ہونے لگا۔ کہ لفظوں میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔

گو پہلے بھی دعا کیا کرتا۔ اور عموماً قبول ہوا کرتی تھی۔ مگر احمدیت کے بعد اپنے آقا ' نامدار کی قوت قدسی سے جو نفع روح نصیب ہوا۔ ایک عجیب ہی رنگ رکھتا تھا۔ پہلے کی دعائیں محض رسمی رنگ رکھتی تھیں۔ مگر حضور پُر نور کی صحبت اور تعلیم کی روشنی میں دعاؤں کا رنگ ہی نرالا ہو گیا تھا۔ اور بجائے محض رسم کے انکے اندر کیا بلحاظ کیفیت اور کیا بلحاظ کمیت ایک حقیقت پیدا ہو چکی تھی میں پہلے محض قشر پر قناعت کئے ہوئے تھا جس کے اندر مغز نہ تھا۔ مگر اب خدا نے مغز عطا فرما دیا تھا۔ اور یہ سب کچھ خالصًا میرے سید و مولیٰ سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عطا کا نتیجہ تھا۔ کہ اس طرح میں ایسی سخت گھڑیوں میں ہلاکت و بربادی سے بچ گیا۔ ورنہ دیرم دتاں میں ہی جو حالات پیش آئے تھے کسی کو تباہ و برباد کرنے کیلئے کافی تھے۔ فالحمد للہ الذی ھدانا لھٰذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ۔

الغرض میں نہائت ہی ہم و غم اور رنج و الم کی حالت میں اس گنجان شیشم کے گھنے سایہ دار حصّہ میں داخل ہوا۔ مگر وہاں سے نکلنے سے قبل مجھے ایسا انشراح بخشا گیا۔ اور مجھ پر سکون و اطمینان نازل فرمایا گیا۔ کہ مصائب و خطرات کی وہ بھیانک تصویریں جو ایک آدھ گھنٹہ ہی قبل مجھے کھانے کو دوڑتیں، خوابہائے پریشان بن بن کر ڈراتیں اور ہلاکت آفرین منظر پیش کرتی تھیں۔ کافور ہو گئیں۔ میں بالکل ہلکا پھلکا اور ہشاش بشاش واپس اپنی قیامگاہ میں پہنچا۔ جہاں والد محترم بعض دیگر رشتہ داروں سمیت میری انتظار میں تھے۔ وہ سب ملے اور ایسے ڈھنگ میں ملے کہ مجھے اپنی دعاؤں کی قبولیت کا یقین ہو گیا۔ اور اسطرح اللہ تعالےٰ نے مجھے اس موقعہ پر بھی شیطانی حملہ سے نجات دیکر اپنے ہاتھ سے بچا لیا۔ فالحمد للہ علی ذالک

تھوڑا حصّہ دن کا جو باقی تھا۔ اسی طرح ملنے ملانے اور نشست و برخاست میں گذر گیا۔ اور سر شام میں پھر تھوڑی دیر کے لئے انسانی نظروں سے اوجھل ہو کر خدائے قدوس کے حضور سجدات شکرگذاری اور اظہار محبت و انکساری کے لئے حاضر ہوا۔ اور فریضہ نماز ادا کر کے طعام و کلام سے فارغ ہو کر لیٹ گیا۔ مہمان نوازوں کو علاوہ مہمان نوازی کے فرائض کے لڑکی کو رخصت کرنے اور رخت سفر باندھنے کی بھی فکر تھی۔ لہذا مجھے گو نہ فراغت مل گئی۔ اور اس طرح قریبًا آدھی رات تک گہری نیند سو لیا۔ آدھی پیچھے جب گھر والے فارغ ہوئے روانگی کی تیاری کا حکم ہوا۔ وہی یکہ بان ہمارا رفیق سفر تھا۔ قافلہ میں اب ایک ساتھی اور کچھ سامان کی ایزادی ہو گئی تھی۔ گھر والوں نے ہندوانہ رسم و رواج کے مطابق رخصت کیا۔ اور گاؤں سے تھوڑی دور باہر الوداع کہنے کو بہت سے عورت مرد آئے اور ابھی رات کا اندھیرا ہی تھا۔ کہ ہمارا یکہ جس راہ سے آیا تھا۔ اُسی سڑک سے واپس ہو لیا۔ راوی کا پتن ناؤ سے پار ہوئے۔ اور ڈیرہ بابا نانک پہنچے۔ جہاں سے تھوڑی دیر سستانے اور گھوڑے کو تازہ دم کرنے کے بعد ہمارا وہی یکہ براستہ فتح گڑھ چوڑیاں امرتسر کیطرف روانہ ہوا۔ اور دو ایک جگہ قیام کرنے اور تازہ دم ہونے کے بعد چلتے چلتے بعد دوپہر ہم لوگ امرتسر رام باغ گیٹ کے باہر پہنچے۔

امرتسر پہنچکر والد صاحب نے یکہ بان کو کرایہ کے علاوہ کچھ انعام دیکر رخصت کیا۔ اور خود شہر کے اندر جاکر کچھ ضروریات خریدیں مجھے ساتھ ہی ساتھ رکھا اور تیسرے ساتھی کو چند مسافر مستورات کے پاس بٹھا گئے۔ اگرچہ ابھی تک مجھے نمازوں کی ادائیگی سے روکا تو نہیں تھا۔ مگر اتنا ضرور فرماتے یا چاہتے تھے۔ کہ میں مخفی طور سے ادا کیا کروں۔ اور احتیاط کروں کہ تیسرے ساتھی کو اس کا علم نہ ہونے پائے۔ میرے قرآن شریف۔ حزب المقبول اور سلسلہ کی چند کتب کا احترام بھی مدّنظر رکھتے تھے۔ جو میں قادیان سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ مگر ساتھ ہی اُن کی یہ بھی خواہش تھی۔ کہ کوئی اور ان کتب کو دیکھ نہ پائے۔ لہذا بہت احتیاط سے اس بکس کو عمومًا مقفل ہی رکھتے تھے۔ اور سفر میں عمومًا تلطف اور شفقت ہی سے پیش آتے رہے۔

اسی روز امرتسر سے بذریعہ ریل گاڑی لاہور اور لاہور سے ملتان لائین کو روانہ ہو کر رات کے کسی حصّہ میں مجھے اب یاد نہیں رہا۔ کسی سٹیشن پر اترے جہاں ایک اونٹ اور دو گھوڑیوں کا انتظام تھا۔ جو ہماری انتظار میں تھے بعد میں معلوم ہوا کہ والد صاحب اپنے علاقہ سے اسی راہ آئے تھے۔ اور یہ سواری اسی دن اپنے ساتھ لیتے آئے تھے۔ تاکہ واپسی میں دقت نہ ہو۔

گاڑی سے اُترتے ہی سامان ٹھیک کر کرا کے منزل مقصود کی راہ لی اور بقیہ حصّہ رات اور دن بھر چلنے کے باوجود کسی ایسے مقام پر نہ پہنچ سکے۔ کہ اطمینان سے رات گذار لیتے۔ زنانہ ساتھ کی وجہ سے رفتار بھی محدود رکھنی پڑی۔ اور کچھ راستہ بھی ناواقف پُرخطر اور ویرانے کا تھا۔ لہذا سفر کو متواتر جاری ہی رکھنا پڑا۔ اور اسطرح بمشکل نصف شب گذری تھی۔ کہ ہمارا یہ قافلہ ڈچکوٹ پہنچا۔ جہاں والد صاحب کے ایک گہرے راز دار دوست پٹواری نہر رہتے تھے چنانچہ ان کے کوارٹر پر پہنچکر دستک دی۔ دروازے کھٹکھٹائے۔ اور بمشکل انکو بیدار کر کے گھر میں داخل ہوئے۔

ڈچکوٹ اُن ایام میں نئی آبادی کی وجہ سے ایک مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ اور علاقہ کی تجارتی منڈی ہونے کے باعث مشہور تھا۔ والد صاحب کی کوشش تو یہی تھی۔ کہ سیدھے اپنے حلقہ میں پہنچیں۔ تاکہ میرے متعلق کوئی استفسار کرے نہ کسی پر اصل حقیقت آشکار ہو۔ والد صاحب کا حلقہ ڈچکوٹ سے ملحق تھا۔ اور جس گاؤں میں ہیڈ کوارٹر تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ تین چار میل ہوگا۔ مگر سواریوں سے زیادہ سوار تھک رہے تھے۔ اس وجہ سے مجبورًا قیام کرنا پڑا۔ اور یہی وہ سرزمین ہے۔ جہاں سے میرے لئے رنج و الم اور دکھ درد کے دروازے کھولے گئے۔ میرے واسطے مصائب کا دور شروع ہو گیا۔ میں مشکلات میں چاروں طرف سے ایسا محصور ہوا۔ کہ بارہا اُن سے نجات کی راہ نہ دیکھ کر جان پر کھیل جانے کو جی کیا کرتا۔ زمین باوجود فراخی کے مجھ پر تنگ ہو گئی۔ اور میں باوجود بھاگ نکلنے کی سچی کوشش کے بھاگنے کی راہ نہ پاتا تھا۔ میری مادر مہربان اور شفیق باپ میری زندگی کو اپنے لئے ایک لعنت سمجھکر میری موت کی تمنا کیا کرتے تھے۔ میرے بہن بھائی جو کبھی میرے پسینہ کی جگہ اپنا خون گرانے میں لذت محسوس کرتے تھے۔ میرے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ اور یہ سلسلہ نہ صرف زبانی سختی اور طعن و تشنیع تک ہی محدود تھا۔ بلکہ اس سے گذر کر ہاتھوں اور لاتوں تک اور پھر کھلتے کھلتے چھڑیوں اور لاٹھیوں کے وار اور مظاہرے بھی اکثر ہوا کئے اور ایک وقت تو حالت یہاں تک پہنچ گئی۔ کہ چھریوں اور کلہاڑیوں تک کے حملے کئے گئے۔ اور کئی کئی نے مل مل کر مجھے گرایا۔ اور چھاتی پر بیٹھ بیٹھ کر جان تک لینے کی کوشش کی۔ یا خوف دلایا۔ اور اسطرح آٹھ نو ماہ کا طویل زمانہ میرے لئے نہائت درجہ رنج و غم اور درد و ستم کا زمانہ تھا۔ تکلیف دینے کی کوئی بات نہ تھی۔ جو میرے لئے روا نہ تھی۔ اور ظلم اور تشدّد کا کوئی طریق نہ تھا۔ جسے میرے بزرگوں اور عزیزوں نے آزمانے کی کوشش نہ کی ہو۔ میرے اس درد کی داستان بہت لمبی اور اتنی دردناک ہے۔ کہ راجہ ہریشچندر کی مصائب و مشکلات اس کے سامنے ہیچ اور حقیقت رائے کے مبالغہ آمیز واقعات اس کے مقابل میں ایک افسانہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اُن لوگوں نے رائی کو لے کر پہاڑ بنا دیا۔ اور طرح طرح کی رنگ آمیزیوں اور ملمع سازیوں سے اپنی خاص مصلحتوں کے ماتحت بعض بالکل معمولی واقعات کو مذہبی رنگ چڑھا چڑھا کر اپنی قوم کے جذبات کو دوسرے مذہب کے پیروؤں کے خلاف بھڑکا بھڑکا کر بعض سیاسی مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنا لیا۔ اور اس کام کے لئے بعض عیار لوگوں نے زندگیاں تک وقف کر دیں۔ اور اس پروپیگنڈا کے لئے ملک کے طول و عرض میں گہری سازشوں کا جال بچھا دیا۔ مگر جو کچھ

مجھ پر گذری اور میرے ساتھ بیتی۔ وہ چونکہ میرے اپنے ہی بزرگوں، محسنوں اور عزیزوں کی طرف سے تھی۔ کسی غیر کا اس میں دخل تھا۔ نہ دوسروں کی طرف وہ مظالم منسوب کئے جا سکتے ہیں۔ اور نہ ہی میں نے اُن امور کا پروپیگنڈا کرنا پسند کیا۔ کیونکہ آخر وہ میرے ہی جنم داتا یا گوشت پوست تھے۔ اور علاوہ بریں بوجہ اس خیال کے کہ انہوں نے جو کچھ بھی کیا۔ قومی غیرت و حمیّت اور ننگ و ناموس کے نام پر کیا۔ اور خواہ انہوں نے انتہائی مظالم ہی روا رکھے۔ مگر ان کے پیچھے جو جذبہ کام کر رہا تھا۔ وہ بہر حال مشفقانہ اور ہر قسم کی عداوت دشمنی اور جوشِ انتقام سے مبرّا تھا۔ اور جو واقعات میرے والدین اور رشتہ داروں کی مصیبت، تکلیف، بدنامی اور خانہ بربادی کے میرے سامنے ہیں۔ جو اُن کو میری تلاش اور واپسی کے دوران میں پیش آئے اس کے مدّ نظر میں بھی اُن کو گونہ معذور اور ناقابل ملامت سمجھتے ہوئے قابلِ معافی سمجھتا ہوں۔ اور یہی وجہ تھی۔ کہ میں نے ان حالات کی تفاصیل کا بیان کرنا کبھی پسند نہ کیا۔ اور اب بھی جو مجملاً تھوڑا سا ذکر بے ساختہ اُن حالات کی یاد میں نکل گیا ہے۔ میں اس اظہار پر بھی ندامت و شرمندگی محسوس کرتا ہوں۔ کیونکہ بہر حال وہ لوگ میرے واجب التعظیم بزرگ تھے۔

ڈھکوٹ کے پٹوار خانہ کے پاس پہنچکر جب ہم لوگ سواری سے اترے اسوقت والد صاحب نے مجھے الگ لے جا کر جو کچھ کہا اور جس رنگ میں کہا وہ جہاں میرے والد صاحب کے دلی ارادوں اور عزم کا آئینہ دار، اُن کی قلبی کیفیات اور منتہائے نظر کا مظہر تھا۔ وہاں میرے افسردہ دل کے لئے ایک ایسی چوٹ تھا جس سے میری ہستی کی بنیادیں ہل گئیں۔ مجھ پر سکتہ کا عالم طاری ہو گیا۔ پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ اور آسمان و زمین میرے لئے اندھیر ہو کر رہ گئے۔ مجھ پر ایسا سناٹا چھایا۔ اور ایسا لرزہ آیا۔ کہ تھوڑی دیر کے لئے میں اپنے آپ سے بالکل کھویا گیا۔ میری زبان بند رہ گئی۔ اور دل و دماغ ایسا بے حس ہوا۔ کہ والد صاحب کو کوئی جواب بھی نہ دے سکا اور میرے حواس اس وقت تک بجا نہ ہوئے جب تک والد صاحب کی زیادہ سخت اور کرخت آواز نے پہلے سے بھی زیادہ سختی و شدت سے اپنے مطالبہ کو نہ دہرایا۔

وہ الفاظ سخت اور طریق خطاب نہائت رنجدہ تھا۔ اور چونکہ لفظ لفظ وہ الفاظ مجھے محفوظ بھی نہیں اور جو یاد بھی ہیں۔ میں اُن کو تحریر میں لا کر کوئی بُری یادگار قائم رکھنا نہیں چاہتا۔ لہذا ان کا خلاصہ در خلاصہ اور مفہوم نرم ترین الفاظ میں لکھ دینا ہی مناسب سمجھتا ہوں جو یہ تھا۔ کہ:-

اب چونکہ ہمارا اپنا علاقہ آ گیا ہے۔ اور تم جانتے ہو کہ ایک رنگ کی حکومت ہمیں یہاں میسّر اور ہماری عزت و عظمت کا چرچہ ہے۔ کسی کی مجال نہیں ہماری طرف آنکھ بھی اٹھا سکے۔ مگر تم نے جو کام کیا ہے۔ اگر اس کا علم کسی کو بھی ہو گیا۔ تو ہماری ساری عزت برباد اور رعب کافور ہو جائیگا۔ ہماری ناک کٹ جائیگی۔ اور ہم کسی کو مُنہ دکھانے کے لائق نہ رہیں گے۔ لہذا خبردار اب نڑی نماز اور کوڑا قرآن پڑھنے کی اجازت نہ ہوگی۔ برابر تین روز سے میں تمہاری ان کرتوتوں کو دیکھتا اور خون کے گھونٹ پیتا رہا ہوں۔ اب بھی اگر تم ان حرکات سے باز نہ آئے۔ اور مسلمانی رنگ تمہاری کسی طرزِ ادا سے بھی ظاہر ہوا۔ تو یاد رکھو کہ تمہاری جان کی خیر نہیں۔ تمہارا کام تو بہر حال تمام کر دیا جائیگا پیچھے جو ہوگا دیکھا جائیگا۔ تمہیں خوب معلوم ہے۔ کہ اس علاقہ میں کوئی تمہاری مدد تو کیا۔ خبر بھی نہ پا سکے گا۔ کیونکہ خون کر کے کھپا دینا ہمارے واسطے یہاں کوئی مشکل نہیں خصوصاً تمہارے جیسے نالائق اور ناہنجار لڑکے کا تو ہونے سے نہ ہونا ہی اچھا ہے۔ تم وہاں خط و کتابت کے وعدے اور عہد و پیمان کر آئے ہو۔ مگر میں دیکھونگا کہ کون تمہیں لکھتا ہے اور کس کو تم جواب دیتے ہو۔ کسی مُسلے کی مجال کیا۔ کہ تم سے مل بھی سکے۔ پس اگر بھلا چاہتے ہو۔ تو سیدھے سیدھے ہو جاؤ۔ اور مسلمانی کے خیال کو بھی دل سے نکال دو۔ وغیرہ وغیرہ

یہ وہ خلاصہ در خلاصہ ہے اس خطاب کا جو والد صاحب نے انتہائی غم و غصہ اور شدّتِ غیظ و غضب کے جوش میں اپنے جلے ہوئے دل کے پھپھولے پھوڑنے کو مجھ سے فرمایا۔ جسے میں نے پہلی مرتبہ بھی سنا اور دوبارہ اور بھی تیز و تند الفاظ میں اور زیادہ غضب آلود لہجہ میں سُنا جس کے نتیجہ میں سچ مچ میرا سارا جسم کانپ گیا۔ اور دہشت کے مارے میں سہم گیا۔ مگر پھر بھی کوئی جواب نہ دے سکا۔ اور خاموش کھڑا رہا۔ جواب کا نہ دینا اور خاموشی اختیار کئے رہنا تسلیم و رضا کی وجہ سے نہ تھا۔ بلکہ والد صاحب کے مقصد و منشا کے خلاف ایک خاموش احتجاج تھا۔ اور اُسے خود والد صاحب بھی محسوس کرتے تھے۔ اور جانتے تھے۔ کہ یہ خاموشی اُن کی مرضی کو پورا کرنے اور ان کی خوشی حاصل کرنے کیلئے نہیں۔ بلکہ ان کی مخالفت پر اصرار اور ضد تھی۔ چنانچہ انہوں نے مجھے جھٹک کر ایک قسم کے رنج گلوگیر کی حالت میں فرمایا "اچھا گھر چل کر دیکھا جائیگا"۔ اور اس کے بعد اپنے دوست کے کمرہ میں جا داخل ہوئے۔ اور میں بھی اُن کے پیچھے پیچھے اندر چلا گیا۔ والد صاحب الگ ایک کمرہ میں دیر تک ان سے باتیں کرتے رہے۔ جو زیادہ تر اسی پیش آمدہ امر کے متعلق تھیں۔ وہ صاحب اگرچہ والد صاحب کے گہرے دوست اور راز دار تھے۔ مگر میں نے محسوس کیا۔ کہ والد صاحب نے اس امر خاص کو اُن سے بھی پوشیدہ ہی رکھا۔ اگرچہ میری تلاش میں اپنی سرگردانی و سرزنی اور بھاری اخراجات کی وجہ سے مالی نقصان اور بربادی کے واقعات کے ذکر میں کوئی اخفاء نہ رکھا۔ مگر میرے مسلمان ہو جانے اور قادیان پہنچنے کا ذکر تک بھی نہ کیا۔ بلکہ اور ہی اور قصے میرے کسی چھاپہ خانہ میں ملازم ہو کر بڑا لائق کام کرنے والا اور نامور ماہر فن متصدی بن جانے کے افسانے سناتے رہے جن کے باعث کارخانہ دار مجھے چھوڑنا نہ چاہتے تھے اور کہ ان کو مجھے وہاں سے نکالنے میں سخت ترین مشکلات کا سامنا ہوا۔ اور اُلٹا لینے کی بجائے کچھ دے کر مجھے فارغ کرانا پڑا۔ اسی اخفاء کے خیال سے والد صاحب نے میرے ساتھ علیحدہ زیادہ دیر ٹھہرنا پسند نہ کیا تھا اور جلد مکان میں آ گئے تھے۔ کہ صاحب خانہ کو شبہ نہ ہو۔ والد صاحب چونکہ متواتر ہفتوں سے سفر میں رہنے کی وجہ سے اور خصوصاً میرے پا لینے کے بعد تین چار رات سے آرام کی نیند نہ سو سکے تھے۔ باتیں کرتے کرتے ہی سو کر غافل ہو گئے۔ مگر مجھے اس تازہ زخم کی وجہ سے چین نہ پڑتا تھا۔ گو تھکان اور کوفت مجھے بھی بے حد تھی۔ اور جسم میرا بھی آرام مانگتا تھا۔ مگر دل کا درد اور جگر کی سوزش بے قرار کئے دیتی تھی۔ کروٹیں لیتا۔ مگر کسی پہلو آرام نہ ملتا۔ ع

دل کی لگی بجھائے کون؟

خیالات کے تموّج اور اجتماع سے دماغ خود پھٹنے کو تھا اس صورت میں بھلا نیند کی گنجائش کہاں۔ اسی طرح قسما قسم کی اُدھیڑ بن اور سوچ و بچار میں رات کی گھڑیاں گن رہا تھا کہ پہلو کے کمرہ کے سکوت نے میرے دماغ کو کسی دوسری طرف پھیر دیا جس کے ساتھ ہی میں لڑکھڑاتے ہوئے اٹھا اور دروازے پر ہاتھ مارا کہ کھول کر نکل جاؤں۔ مگر وائے قسمت کہ در بند تھا۔ اور میں محصور۔ ناچار کلیجہ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اور سر تھام کر رہ گیا۔ اور **لا ملجاء و لا منجاء منک الا الیک** کے ورد میں مصروف ہو گیا اور دل دعا کی طرف جھکتا گیا جس کے بغیر اور کوئی راہ کھلی نہ تھی۔ مرغ سحر بولے جس سے رات کی آخری گھڑیاں معلوم کر کے اس فرصت کو غنیمت جانا۔ اور کارساز حقیقی سے راز و نیاز اور عرض حال میں مصروف ہو گیا۔ سچ ہے مصیبت اور دکھ درد کی رات لمبی ہو جاتی ہے۔ اور ختم ہونے میں نہیں آتی۔ مگر یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔ کہ جب درد میں لذت پیدا ہو جائے تو نہ درد درد رہتا ہے نہ اس کا زمانہ لمبا اور طویل معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ اس کا جلد ختم ہو جانا گونہ حسرت و تکلیف کا باعث ہوتا ہے۔ اور ایک قسم کی پیاس اور تشنگی معلوم ہونے لگتی ہے۔ میں ایک قسم کے ذوق اور لذت و سرور میں تھا۔ کہ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر کا روح پرور نغمہ کان میں پڑا۔ جس سے میرے حواس میں تازگی کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے بصد عجز و نیاز وقت کا فریضہ ادا کیا۔ اور آنے والے حالات کے لئے اپنے آپ کو تیار کر لیا۔ جن کے متعلق دل میں ایک کشمکش اور خلجان تھا۔

گھر والے جاگے۔ والد صاحب ہوشیار ہوئے

اور میرا دروازہ کھول کر تجاہل عارفانہ کے رنگ میں دروازہ کے باہر سے بند ہو جانے پر افسوس کر کے مجھے ساتھ لیا اور جنگل وغیرہ سے فراغت پا کر جلد جلد روانگی کی تیاری کی۔ اور صاحب خانہ کے اصرار کے باوجود اندھیرے ہی اندھیرے روانہ ہو کر سویرے ہی سویرے اپنے منزل مقصود بھاگو والہ غالباً چک نمبر ۶۲ جا پہنچے۔ یہ بھاگو والہ ضلع گورداسپور کے بھاگو وال سرداران ہی سے وہاں جا کر آباد ہوا ہے۔ اور جہاں سکھ سردار یا زمیندار وہاں جا کر آباد ہوئے ہیں۔ اُن کے ساتھ ساتھ بعض ان کے کمین مسلمان بھی گئے ہیں جن میں بعض بردا لے اور چوکیدار کشمیری بھی تھے۔ جو ہمارے محترم برادران سیکھوانی کے رشتہ دار اور واقف کار بھی تھے۔ یہ حلقہ ٹیوالہ پانچ دیہات پر مشتمل تھا۔ اور مصلحت الٰہی کہ پانچوں دیہات سکھوں بلکہ زبردست اور متعصب سکھوں کے تھے۔ جن میں سے ایک دیہہ میں جو سڑک ڈچکوٹ کے کنارے واقعہ تھا جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ ایک مرکزی گردوارہ اور ان کا مذہبی مرکز بھی قائم تھا۔ جہاں میرے والد صاحب بھی خاصہ حصہ لیا کرتے تھے۔ جس کے نتیجہ میں سکھوں میں وہ مذہبی لحاظ سے بھی محبت و عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اور اس طرح ان کا اپنے حلقہ میں دُہرا اثر و رسوخ تھا اور اس پر ان کو ایک قسم کا حد سے بڑھا ہوا ناز تھا۔ اور اسی کی طرف انہوں نے ڈچکوٹ پہنچ کر مجھے مخاطب کرتے ہوئے اشارہ کیا تھا۔

ہمارا یہ مختصر سا قافلہ ابھی گاؤں سے باہر ہی تھا۔ کہ والد صاحب قبلہ اپنی سواری کو ایڑ لگا کر آگے نکل گئے تاکہ گھر والوں کو ہمارے آنے کی اطلاع دیں۔ آج کے سفر میں مَیں ان کی ہر حرکت و سکون اور طرز و ادا میں ایک خاص شان محسوس کرتا تھا۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ اب یہ ان کا علاقہ اور حلقہ تھا۔ مگر زیادہ تر اس وجہ سے کہ ان کو اپنی کامیاب واپسی ایک فاتحانہ شان و شوکت کے اظہار پر آمادہ کر رہی تھی۔ کم و بیش چھ ماہ متواتر کی دوڑ دھوپ اور تگ و دو کے بعد، کئی ویرانے اور جنگلوں، سنسان بیابانوں کی خاک چھاننے کے بعد بیسیوں شہروں درجنوں دیہات کے گلی کوچوں کی چھان بین کے بعد اور ہزاروں روپیہ کے بے دریغ بہا دینے کے بعد وہ حصول مقصد میں کامیاب ہو رہے تھے۔ لہٰذا ان کے لئے گویا قدرت نے بھی ایسی شان و شوکت کے اظہار کا موقعہ میسّر فرمایا تھا۔ اور آج وہ قدرت کی اس نیاضی سے جی کھول کر اور پیٹ بھر کر فائدہ اٹھا رہے تھے۔

قادیان ہاں مقدس و پیاری بستی قادیان کی یاد دل سے کسی وقت بھی محو نہ ہوتی تھی۔ اور میں ہر وقت ہی عالم خیال میں کوچہ ہائے دارالامان میں پھرتا رہتا تھا۔ یہ درست ہے کہ میرے والد صاحب میرے قادیان سے لے آنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اور میں ان کی کڑی اور نہائت کڑی نگرانی میں ایک اسیر بے دست و پا کی مثال محبوس و گرفتار تھا۔ اور اُن کی مرضی کے خلاف چار قدم بھی اِدھر اُدھر نہ جا سکتا تھا۔ مگر میری روح یقیناً آزاد تھی۔ اور دل و دماغ ہر قسم کی قیود و بند اور نگرانی کی حدود سے بالا تھے۔

اِن مشکلات و مصائب کے پہاڑ تلے دبے ہوئے بھی میری روح اپنے آقائے نامدار کی مجلس میں پہنچکر حضورؑ کے کلمات طیبات سے مستفیض ہوتی اور حضور پر نور کی زبان فیض ترجمان سے الم احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا آمنا وھم لا یفتنون کی سُریلی اور کیف آور گونج گوش ہوش سے سُن پاتی تو یقیناً اس میں زندگی کی ایک جھلک اور امید کی لہر دوڑنے لگتی جس سے مجھے ان مشکلات اور ابتلاؤں پر فتح پانے اور غالب آنے کی قوت و عزم میسر آ جاتا۔ اور دل کو غیر معمولی سکون اور ڈھارس نصیب ہوتی۔

دارالامان کی مختصر سی اس زندگی میں بارہا میں نے حضورؑ کی زبان مبارک سے قرآن کریم کی یہ آئت سنی اور سُن سُن کر ہی یاد ہو گئی تھی۔ اور جس موقعہ و محل پر حضور اس کو ذکر فرمایا کرتے اور جو مفہوم و مقصد حضورؑ اس سے لیا کرتے تھے۔ وہ میرے ذہن میں مستحضر ہو جاتا۔ اور جو مثالیں حضورؑ اس مضمون کی تائید میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے حالات اور واقعات کا ذکر فرما کر بیان فرمایا کرتے سبھی یاد آ کر میرے دل کو قوی کر دیا کرتی تھیں۔

سیدنا حضرت مسیح پاک علیہ الف الف صلوٰۃ والسلام کا ایک اور منقولہ بھی ایسے اوقات میں اکثر میری راہنمائی کیا کرتا تھا۔ "خدا داری چہ غم داری" یہ کلمات بھی حضورؑ کی زبان مبارک سے اکثر سننے میں آیا کرتے تھے۔ اور اسی وقت مجھے یاد ہو چکے تھے۔ ورنہ اس سے قبل میں نے یہ کلمات نہ کبھی سنے تھے نہ کہیں پڑھے تھے۔ یہ کلمات اپنے اندر جو مقناطیسی اثر رکھتے ہیں۔ یاد آ کر لازماً مجھ پر بھی اثر انداز ہوتے اور زندگی میں تازگی کی روح پھونک دیا کرتے تھے۔

قصۂ مختصر! جوں جوں ہمارا قافلہ اس بستی کی طرف بڑھتا اور قریب ہوتا جاتا تھا۔ توں توں میری روح پیچھے کو بھاگتی اور اپنے آقا کے حضور فریاد کر کر کے طالب مدد و دعا ہوتی تھی۔ ابتدا سے انتہا تک کے سارے حالات و واقعات آنکھوں کے سامنے آ رہے تھے۔

(۱) اوّل مرتبہ حضرتؑ کے حضور پیش ہونے کے وقت میری کم عمری اور بچپنے کی وجہ سے جو کچھ اس مرسل یزدانی نے فرمایا (۲) والد صاحب کے قادیان پہنچکر میرے حصول کی کوشش کرنیکے نتیجہ میں آخر جو کچھ حضور نے فرمایا (۳) مخدومنا حضرت حکیم الامت مولانا مولوی نور الدینؓ اعظم کی درخواست پر کہ "حضور نے عبدالرحمن کو والد کیساتھ جانے کا حکم دیا ہے۔ اگر حضور پسند فرمائیں تو بھائی عبدالرحیم کو ان کے ہمراہ بھیجدیا جائے" کے جواب میں جس رنگ میں اور جس جوش میں میرے آقا نے اظہار خیال کیا اور جو کچھ فرمایا یہ سب کچھ ایک طرف میرے سامنے تھا۔ اور دوسری طرف وہ بستی اور وہ عزیز و رشتہ دار جنکو میں ۶ جون ۱۸۹۵ء کے دن ہمیشہ کے لئے الوداع کہکر نکل کھڑا ہوا تھا۔ اب پھر آنکھوں کے سامنے آ رہے تھے۔ بلکہ ہر قدم مجھے ان کے قریب کرتا جا رہا تھا۔ ایسے نازک وقت میں میرے دل میں کیا کیا گذر رہا تھا۔ اور کس کس قسم کے خیالات اٹھتے اور کیا کیا اثرات پیدا کرتے تھے ان کا جمع کرنا اور لکھنا میرے لئے ناممکن ہے۔ انکو میرے خدا اور میرے دل ناتوان کے سوا کوئی خیال میں بھی نہیں لا سکتا۔ لہٰذا یہی بہتر ہے۔ کہ وہ پردہ راز ہی میں رہیں۔

والد صاحب کے گاؤں پہنچنے اور خاص انداز سے پہنچنے کے باعث ایک چرچہ ہو چکا تھا۔ گھر والوں کو اطلاع مل چکی تھی۔ اس وجہ سے جہاں گاؤں کے مرد اور عورتیں ہمیں دیکھنے کو گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور ہمیں آتا دیکھ کر جو جس کے جی میں آتا کہتا۔ جتنے مونہہ اتنی باتیں تھیں۔ کوئی خوشی کا اظہار کرتا۔ کوئی ملامت کر کے دکھے دل کو اور بھی دکھاتا تھا۔ کسی کا لہجہ مشفقانہ تھا۔ تو کسی کا سخت و کرخت اور طعن آلود۔ اور بیباکانہ اکثروں نے مصلحت اور حکمت سے نصیحت کا پہلو اختیار کیا تو بعض نے محبت کیساتھ ساتھ ہمدردی بھی جتائی۔ اور اسطرح مجھے تلخ و گرم اور سرد و نرم میں سے گذرتے ہوئے بستی کے شمالی جانب والد صاحب کے کوارٹر تک جانا پڑا جہاں گاؤں کی عورتوں کا ایک ہجوم ہمارے پہنچنے سے قبل ہی قبل والدہ محترمہ اور عزیزہ ہمشیرہ کو مبارکباد کہنے کی غرض سے جمع ہو چکا تھا۔

گھر پہنچے۔ واجبی سلام کلام کے بعد رسمی آؤ بھگت میل ملاپ اور پیار دلاسا پر ہی اکتفاء رہا۔ شکوے شکائت اور غم و غصہ کے اظہار کو کسی دوسرے فارغ وقت کے لئے اٹھا رکھا گیا۔ اور موقعہ کے مدنظر بڑے ضبط سے کام لیا گیا۔ اور میں سمجھتا ہوں۔ کہ یہ مرحلہ ہمارے نئے ساتھی کی وجہ سے میرے لئے آسان ہو گیا۔ کیونکہ مستورات دیہہ اور گھر والوں کی ساری توجہ انہیں کی طرف منعطف ہو گئی۔ اور اسطرح مجھے کچھ وقفہ علیحدہ ہو کر اللہ تعالےٰ کے حضور عرض حال اور التجاء و دعا کیلئے مل گیا۔ اور چونکہ آنے جانے والی عورتوں اور مردوں کا سلسلہ دن بھر ہی جاری رہا۔ اس وجہ سے مجھے گو نہ فرصت ہی رہی۔ اور آج کے دن کے فرائض کی ادائیگی کا بھی اللہ کریم نے بہترین اور آسان راہ پیدا کر دیا۔

رات کے اندھیرے میں جب کہ گھر والوں کو فرصت ہوئی ضروریات سے فارغ ہو کر والدہ محترمہ، ہمشیرہ عزیزہ اور میرے دونوں بھائی میرے گرد جمع ہوئے۔ اور لگے باری باری سے اپنے دلوں کا بخار اور سینوں کی بھڑاس نکالنے۔ گھر والوں کو میرے اسلام کی اطلاع تھی۔ اس وجہ سے اُن کے دل بہت ہی بھرے ہوئے تھے۔ نہ معلوم دن بھر کس ضبط سے انہوں نے کام لیا۔ اور کیسے اتنا لمبا صبر کر سکے۔ اس فرصت اور تنہائی میں جہاں سبھی پھوٹ پھوٹ کر روئے وہاں والدہ محترمہ نے تو حق مادری کا بھی دل کھول کر استعمال فرمایا۔ اور جوش رنج میں یہاں تک بڑھ گئے۔ کہ چاقو لیکر اپنے سینہ تک کو چاک کر کے مجھے اپنے داغہائے دل دکھانے کو

آمادہ ہو گئے۔ اور اگر عزیزہ ہمشیرہ ہوشیاری اور ہمت سے کام لیکر ان کا ہاتھ نہ روک لیتیں۔ تو خدا معلوم کیا ہو جاتا۔ میں سر ڈالے بیٹھا تھا۔ مجھے تو خبر بھی نہ تھی۔

رات قریبًا ایسی ہی کشمکش اور گریہ وزاری میں بیت گئی۔ والدہ اور ہمشیرہ نہ سوئیں اور نہ ہی انہوں نے مجھے سونے دیا مطالبہ اُن کا سخت تھا جس کے لئے انہوں نے کبھی محبت و پیار کی انتہا کر دی تو کبھی گریہ و بکا کی کوئی حد نہ رہنے دی کبھی قومی حمیت اور خاندانی عزت کے واسطے ڈالے تو کبھی ننگ و ناموس پر جان نثار کر دینے والے اسلاف کے تذکرے سُنا سُنا کر اپنے مطلب کا بنانے کی کوشش کی۔ کبھی مجھے ڈرانے اور دھمکانے کی کوشش کی اور جان تک کا خوف دلایا۔ تو کبھی اپنی جانوں پر کھیل جانے اور میرے سر چڑھ مرنے کی دھمکیاں دیں۔

والدہ صاحب نے گو اس وقت کوئی دخل نہ دیا۔ مگر اس ساری کارروائی کو پاس ہی بیٹھے دیکھا سنا کئے۔ کبھی کبھی کوئی فقرہ والدہ محترمہ کی تائید یا ہمشیرہ عزیزہ کی حمائت میں فرما دیتے تھے۔ اور اس طرح گویا بالواسطہ وہ بھی وہی کام کر رہے تھے۔ مگر مطالبہ ان کا ایسا سخت اور ایسا کڑا تھا۔ کہ اس کے مقابلہ میں اُن کے سارے ہی ہتھیار کند و نکمے اور ہر قسم کی کوششیں بیکار اور بے سود تھیں۔ اور میں ان کو قبول کرنے کیلئے انتہائی خوف کی وجہ سے تیار تھا نہ انتہائی طمع و محبت مجھے اس کیلئے آمادہ کر سکتی تھی۔ اور جس غیرت و حمیت کا واسطہ مجھے دیا جاتا تھا وہی غیرت و حمیت مجھے اپنے مقام پر قائم اور ثابت قدم رہنے کی تلقین کرتی۔ اور جو کارنامے سنا سنا کر مجھے اپنے مقام سے ہٹانے کی کوشش کی جاتی تھی اس سے ہزارہا درجہ بہتر و اعلیٰ اور حقیقی کارنامے اسلام کی خاطر قربانیاں کرنے والوں کی میرے پیش نظر تھیں جن کا زندہ نمونہ اور تازہ مثالیں اللہ تعالےٰ نے مجھے دیکھنے کا نہ صرف موقعہ دیا بلکہ اُن کی صحبت میں رہ کر اُن کی قوت قدسی اور روحانیت سے متمتع ہونے کی سعادت نصیب کی۔ جس کی برکت اور طفیل سے میرے بزرگوں اور محسنوں کے قوی سے قوی دلائل اور کاری سے کاری حربے بھی میرے لئے ہیچ اور بے اثر تھے۔ والدہ اور ہمشیرہ کے جذباتی تأثرات بھی میرے قلب کے اس لذت و سرور کو دور کرنے سے عاجز تھے۔ گھر والے "گربہ کشتن روز اوّل" کی فکر میں تھے۔ ان کو اندیشہ تھا۔ کہ بات نکل گئی۔ تو معاملہ ہاتھ سے نکل جائیگا۔ اور پھر اس کا کوئی علاج نہ ہو سکے گا۔ ان کی ساری کوشش اور سعی اسی یقین و وثوق اور قوت و ارادہ سے تھی۔ کہ وہ ضرور کامیاب ہونگے۔ کیونکہ جس رسمی اسلام کے خلاف اُن کا جہاد تھا۔ اور جن نام کے مسلمانوں کو مدّنظر رکھ کر مجھے اسلام و مسلمانی سے پھیرنے کی جد و جہد کر رہے تھے۔ اس لحاظ سے ان کا گمان ایک حد تک اپنے اندر کچھ حقیقت و اصلیت بھی رکھتا ہوگا۔ مگر وہ میرے متعلق ایک غلط فہمی کا شکار تھے۔ اور اُن کی ساری تگ و دو چونکہ امر واقعہ سے ناواقفیت پر مبنی تھی۔ جو ابتداء سے لیکر انتہا تک متواتر کئی ماہ انہوں نے جاری رکھی۔ اور باوجود استقلال کے وہ کامیابی کا مونہہ نہ دیکھ سکے۔ وہ حقیقی اور زندہ اسلام اور اس کے اثر و جذب سے بے خبر تھے۔ ان کو اس بات کا علم ہی نہ تھا۔ کہ حلاوت ایمان میسّر آجانے کے بعد انسان کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ ورنہ شائد نہ وہ اتنی سرگردانی کی زحمت اٹھاتے۔ نہ اپنے مال و منال کو یوں اٹھاتے اور نہ ہی وہ مجھے طرح طرح کی اذیت پہنچا کر خون جگر کھاتے بلکہ میرے اسلام لے آنے کی اطلاع پاکر ہی صبر کر بیٹھتے اور اصلیت بھی یہی ہے۔ کہ اگر اللہ تعالےٰ نے خود ہی میری دستگیری فرما کر اس نور اسلام سے منور نہ کیا ہوتا۔ جسے اس نے اس زمانہ میں دوبارہ اس نبی آخر الزمان کے ذریعہ زندہ کر کے زندگی بخش اور روح پرور بنا دیا ہے۔ تو شائد ان کی ترغیب و ترہیب اور مسلسل و سرگرم مساعی کا کوئی نتیجہ کسی نہ کسی رنگ میں دیکھنا اُن کو نصیب ہو ہی جاتا۔ مگر یہاں تو "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" والا معاملہ تھا۔ اس "بیمار محبت و وفا" کا مرض بجائے گھٹنے کے بڑھتا ہی گیا۔ اور ان کی ساری مساعی اس کشتۂ ایمان کو کھاد ہو کر لگتی رہیں۔

وہ رات گذری، دن چڑھا اور گذر گیا۔ اور اسی طرح چند اور روز تک جس طرح لیل و نہار بدلتے رہے میرے والدین اور اقارب کی سرگرمیاں اور مساعی بھی بدلتی ہوئی جاری رہیں۔ کبھی نرمی ہوتی تھی۔ اور کبھی گرمی آجاتی تھی۔ کبھی پیار و محبت بلکہ منت و سماجت سے کام لیا جاتا تھا۔ تو کبھی تنگ ہو کر درشتی و سختی اور ناراضگی و تشدد بھی برتا جاتا تھا۔ غرض چند روز متواتر یہی سلسلہ خاص اہتمام اور تسلسل سے جاری رہا اور جب انہوں نے دیکھا۔ کہ کامیابی کی کوئی راہ باقی نہیں۔ اور اُن کے سارے حیلے ختم ہو چکے ہیں۔ تو مایوس ہو کر اپنے آخری اور اوچھے ہتھیاروں پر اتر آئے جس کا اجمال اور خلاصہ یہ ہے۔ کہ ایک روز علی الصّباح جبکہ میں حسب معمول تلاوت کے لئے قرآن شریف لینے کو اس کمرہ میں گیا۔ جہاں میں نے اُن کو الگ اور ممتاز جگہ رکھا ہوا تھا۔ تو میں نے اُن کو وہاں نہ پایا۔ میرا قرآن شریف وہاں تھا نہ دوسری کتب میں نے ادھر اُدھر ہاتھ مارنے شروع کئے۔ اور تلاش کرنے لگا۔ مگر کہیں کچھ نہ ملا۔ آخر بہت سا سامان نیچے اوپر کر دینے کے بعد بعض لحافوں کے نیچے قرآن شریف کے بعض ٹکڑے ملے جس سے میں نے اندازہ کر لیا۔ کہ کسی نے یہ ظلم کیا ہے۔ کہ قرآن شریف اور دوسری کتب کو پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ چنانچہ مجھے اور زیادہ جستجو ہوئی۔ جس کے نتیجہ میں مجھے بعض ایسے آثار ملے کہ سنگدلی اور قساوت کا مظاہرہ ان مقدس کتب کو جلا دینے کے رنگ میں بھی کیا گیا تھا۔ میں نے یہ سب کچھ دیکھا اور کلیجہ پکڑ کر رہ گیا۔ گو میں نے اس ظلم اور انتہائی تشدد کے خلاف زبان سے کچھ نہ کہا۔ مگر میرے سینہ میں رنج و درد اور حقارت و نفرت کے جذبات سے ایسی ایک قسم کی سٹیم پیدا ہو کر بھر گئی۔ کہ اگر میں صبر و ضبط سے کام نہ لیتا۔ تو وہ گھر بھر کو جلا کر راکھ کر دیتی۔ یا ایسا ظلم و ستم کرنے والوں اور اُن کے حامیوں کے پرخچے اڑا دیتی۔ مجھے اتنا غضب چڑھا جس سے میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ میرے دل میں اس شدت سے درد اٹھا۔ کہ میرا سارا جسم کانپنے لگا۔ دل میں جوش اٹھا۔ کہ گھر کو آگ لگا دوں۔ کہ جل کر راکھ کا ڈھیر بن جائے۔ یا کدال لے کر گرا دوں۔ کہ اس کا نام و نشان مٹ جائے۔ اور وہ زمین کے برابر ہو جائے۔ مگر اس وقت گھر میں صرف ایک بے زبان عورت اور میری ہمشیرہ کے سوا کوئی نہ تھا۔ جو دونوں میری اس کیفیت سے خوفزدہ اور حراساں تھیں اور ممکن کہ اُن کو اس معاملہ کا علم بھی نہ ہو۔ ہمشیرہ عزیزہ سے مجھے بے انتہا محبت تھی۔ اور اس بے زبان عورت پر ایک قسم کا رحم آتا تھا جس سے میں بالکل بے بسی کی حالت میں خون جگر پی کر رہ گیا۔ اور بجائے کسی پر برسنے کے کمرہ میں بند ہو کر اپنے ہی اوپر برسا اور رو رو کر دل کی بھڑاس نکال لی اور ٹھنڈا ہو گیا۔

یہ ظلم کرنے والوں نے تو اپنے خیال میں میرے ایمان کی عمارت ہی کو مسمار کر دیا۔ اور میری توجہات کے مرکزی قلعہ کو گرا کر مجھے بے سروسامان کر دیا تھا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اُن کے اس ظلم سے میرے اندر نور ایمان کی شعاعیں اور زیادہ تیز ہو کر چمکنے لگیں۔ اور محبت و عشق اور صدق و صفا کے جذبات زیادہ مضبوطی اور تیزی سے میرے دل میں شعلہ زن ہونے لگے۔ اور والدین کے اس فعل کے خلاف میرے دل میں کبھی نہ مٹنے والے جذبات حقارت و نفرت پیدا ہو گئے۔ اور پھر یوں ہوا کہ جوں جوں انہوں نے مجھے دبانے اور مٹانے کی کوشش کی توں توں اللہ کریم نے مجھے اٹھنے اور ابھرنے کی توفیق بخشی اور اسی طرح شب و روز گذرنے لگے۔ کہ وہ اپنے کام میں تیز ہوتے گئے۔ اور انتہائی مظالم تک کا مجھے نشانہ بناتے رہے۔ قید و بند سے گذر کر انتہائی تشدد کیا جاتا رہا۔ اور اکثر ایسا ہوا۔ کہ جان تک لے لینے کی کوشش کی گئی۔ مگر اللہ کریم کی باریک در باریک مصلحتوں کے ماتحت آخر کوئی نہ کوئی راہ میری سلامتی اور جانبری کی پیدا ہو ہی جایا کرتی رہی۔ جس سے متاثر ہو کر گاہ بگاہ والدین کے مونہہ سے نکل ہی جایا کرتا تھا۔ "پرمیشور جانے یہ کیسا ہی سخت جان واقعہ ہوا ہے۔ کہ مارے مرتا ہے۔ نہ کاٹے کٹتا ہے۔"

یہ وہ رنج و غم اور درد و کرب کا زمانہ تھا۔ کہ اس کی یاد آج بھی مجھ پر کپکپی سی پیدا کر دیتی ہے اور میں اس کو بھلا دینے کیلئے آنکھیں بند کر لیا کرتا ہوں۔ اسی زمانہ میں مجھے فرائض کی ادائیگی تک سے محروم کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ اور مجھ پر بھاری پہرہ اور کڑی نگرانی مقرر تھی۔ یہی وہ زمانہ تھا۔ کہ بعض اوقات کئی کئی نمازیں ملا کر پڑھتا تھا۔ اور اکثر ایسا بھی ہو جاتا تھا۔ کہ اشاروں ہی میں فریضہ نماز

ادا کرنا پڑتا تھا۔ اسی جور و ستم کے زمانہ کا واقعہ ہے۔ کہ ایک روز علی الصبح میں گھر سے باہر قضاء حاجت کے بہانے سے گیا۔ گیہوں کے کھیتوں کے اندر وضو کر کے نماز پڑھ رہا تھا۔ کہ ایک شخص کدال لئے میرے سر پر کھڑا رہا۔ نماز کے اندر تو یہی خیال تھا کہ کوئی دشمن ہے۔ جو جان لینے کیلئے آیا ہے۔ لہٰذا میں نے نماز کو معمول سے زیادہ لمبا کر دیا۔ اور آخری نماز سمجھ کر دعاؤں میں لگا رہا۔ مگر سلام پھیرنے کے بعد معلوم ہوا۔ کہ وہ ایک مسلمان مزدور تھا کشمیری قوم کا۔ جو مجھے نماز پڑھتے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اور جب میں نماز سے فارغ ہوا۔ تو نہائت محبت اور خوشی کے جوش میں مجھ سے پوچھا۔

”منشی جی! کیا یہی پکّی بات ہے۔ کہ آپ مسلمان ہیں؟“

اثبات میں جواب پا کر میں نے دیکھا۔ کہ وہ خوشی کے مارے اچھل پڑا۔ اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ میں نے گو بہت احتیاط کی تھی۔ اور نماز شروع کرنے سے قبل اِدھر اُدھر دیکھ لیا تھا۔ کہ کوئی دیکھنے والا تو نہیں۔ مگر وہ شخص میری نظروں سے اوجھل ہی رہ گیا تھا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی باریک در باریک مصلحت کے ماتحت ہی ایسا ہوا تھا۔ جب اس شخص نے مجھ سے میرے اسلام کا سوال کیا۔ تو میں نے جواب کے ساتھ اس کو یہ بھی کہہ دیا۔ کہ ہاں میں اللہ تعالےٰ کے فضل سے اسلام پر قائم ہوں۔ اور اللہ تعالےٰ نے تمہیں میرے لئے گواہ بنا کر بھیجا ہے۔ کہ کم از کم تم میرے اسلام کے شاہد رہو گے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ تم نے مجھے عین حالتِ نماز میں دیکھا۔ ورنہ میں نے پوری احتیاط کر لی تھی۔ کہ کوئی مجھے دیکھنے نہ پائے۔

اسی تیرہ و تار اور پُر ظلم و ظلمات کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ جب مجھے قادیان سے آئے ہوئے عرصہ ہو گیا۔ اور میری طرف سے کوئی خبر خیریت کی اطلاع دارالامان میں نہ پہنچی تو میرے محسنوں اور بزرگوں، دوستوں اور بھائیوں کے دل میں تشویش، بےچینی و بیقراری پیدا ہوئی۔ اور میری خبرگیری و امداد کا جوش اٹھا۔ اس مقدس بستی کے رہنے والوں کے دلوں میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوا جس کے نتیجہ میں علاوہ دعاؤں کے جوان بزرگوں نے میری مشکلات کے زمانہ میں میرے لئے کیں ایک نیک دل اور پاک نفس انسان کو (جنکا نام نامی مولوی خدا بخش جالندہری تھا۔ درمیانہ قد، سیاہ فام عمر رسیدہ بزرگ جو اس زمانہ میں ہی حنا کیا کرتے تھے) دریافت حال کی غرض سے میرے پیچھے بھیجا گیا۔ وہ بزرگ اپنے اندر تبلیغ اسلام کا ایک خوش رکھتے تھے۔ اور عموماً سیاحانہ زندگی کے عادی واعظ تھے اور مجھے خیال ہے۔ کہ ماسٹر عبدالرحمن صاحب جالندہری (جو آجکل ماسٹر عبدالرحمن صاحب بی۔ اے کے نام سے مشہور ہیں) کے اسلام لانے میں بھی ان کی مساعی کا کچھ نہ کچھ دخل تھا۔ وہ بزرگ دیہہ بدیہہ اور قریہ بقریہ پھرتے ہوئے طویل اور سخت سفروں کی تکالیف برداشت کرتے ہوئے ایک لمبے عرصے کے بعد مجھ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ اور بشکل میرے متعلق صرف اتنی خبر پا سکے کہ عبدالرحمٰن زندہ ہے۔ مسلمان ہے اور کہ انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے عبدالرحمٰن کو زندہ دیکھا۔ اور اسلام کی تصدیق کرائی ہے۔ بس

ایک روز صبح کے وقت جبکہ سورج کچھ بلند ہو چکا تھا۔ والد صاحب گشت یا گرداوری کی غرض سے باہر تشریف لے جا چکے تھے۔ گھر کی مستورات اور میرے بھائی گھر میں اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے، اچانک میرے دل میں کچھ گدگدی سی ہوئی۔ اور از خود رنگی پیدا ہو کر ایک اُبال اٹھا جس سے بیقرار ہو کر میں کمرہ سے نکل صحن میں ٹہلنے لگا۔ اِدھر اُدھر دو چار ہی چکر لگائے ہونگے۔ کہ ”منشی جی“ کی ایک دھیمی اور لرزتی ہوئی آواز کان میں پڑی دل کسی تحریک غیبی کے ماتحت پہلے ہی سے گوش ہوش بنا ہوا تھا۔ اُدھر آواز میں ایک قسم کا تعارف اور شناسائی سی محسوس ہوئی۔ جھٹ دروازہ کھولکر باہر جا کھڑا ہوا۔ جدھر سے آواز آئی تھی۔ آنکھیں اُدھر کو گاڑ دیں۔ مگر سامنے کوئی نظر نہ آیا۔ آخر چند قدم حرکت کر کے آگے بڑھا. تو کیا دیکھتا ہوں۔ کہ وہی بزرگ مولوی خدا بخش نامی جو ایک پیلو کے جھاڑ کی اوٹ میں کھڑے تھے۔ سامنے ہو کر السلام علیکم بولے میں نے ”وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ و برکاتہ“ کے الفاظ میں جواب دیا۔ مگر آواز کے سنبھالنے کی بھی ساتھ ہی فکر رکھی۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارہ سے دُور ہی دُور کھڑے خیریت پوچھکر اسلام کا سوال کیا۔ جس کا میں نے بھی اشاروں ہی اشاروں میں جواب دیا۔ اور وہ مطمئن ہو کر جلدی جلدی آگے نکل گئے۔ ٹھہرنا انہوں نے ہی مناسب سمجھا۔ نہ میں نے اُن کو زیادہ روکنا مناسب سمجھا۔ اور اسی دیدۂ دُور کو غنیمت جانتے ہوئے آن کی آن میں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ اور بات ایسی معلوم دینے لگی جیسے کسی نے خواب دیکھا ہو مولوی صاحب محترم اپنی جگہ خوفزدہ اور سہمے ہوئے تھے اور جو کچھ انہوں نے کیا۔ اُس سے زیادہ کوئی کر بھی نہ سکتا تھا۔ اور میں اپنی جگہ احتیاط اور افشاء راز کے خیال سے جتنا موقعہ ملا اور جو کچھ ہو سکا اس کو کافی سمجھ کر صبر کر بیٹھا۔ مولوی صاحب مکرم پھرتے پھراتے پوچھتے پچھاتے ہمارے ہیڈ کوارٹر سے تین چار میل کے فاصلے ایک اعوان قوم کی مسلمان بستی میں شب باش ہوئے تھے۔ جہاں سے ضروری حالات کا علم لینے اور احتیاطی تدابیر کے ساتھ کام کرنے کی ہدایات لے کر وہ علی الصبح اٹھے اور ہمارے ہاں پہنچے تھے۔ اور دور ہی دور سے ایک دوسرے کی خبر لینے دینے کا کام ہو سکا تھا۔ مولوی صاحب گاؤں کیطرف بڑھے مگر راستہ چھوڑ کر باہر ہی باہر ہو کر کھیتوں میں سے نکل گئے۔ جب تک وہ نظر آتے رہے۔ میں کھڑا اُن کی پیٹھ دیکھا کیا۔ اُن کے آنکھوں سے اوجھل ہو جانے کے بعد کچھ سوچ اور فکر کے بعد میں گھر کے اندر چلا گیا۔ اور چونکہ مجھ پر اس وقت ایک خاص حالت طاری تھی۔ سب سے جدا ہو کر لیٹ گیا۔ اور کسی گہری سوچ میں پڑ گیا۔ ابھی میں اسی سوچ ہی میں تھا۔ کہ والد صاحب قبلہ باہر سے جلد جلد آئے اور میرے متعلق دریافت فرمایا۔ کہ کہاں ہے؟ اور پھر میرے پاس تشریف لا کر پوچھا۔ ”آج کون مولوی آیا تھا۔ اور وہ کیا کہتا تھا۔ اب وہ کدھر کو گیا ہے؟“ لب و لہجہ سے غم و غصہ عیاں تھا۔ میں بھانپ گیا۔ کہ مولوی صاحب کی آمد کی اِطلاع والد صاحب کو ہو گئی ہے۔ مگر میں نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے عرض کیا۔ ”کون مولوی صاحب آپ کی مراد ہیں۔ میں نہیں جانتا کدھر سے آئے اور کدھر کو گئے؟“ والد صاحب پھر جلدی جلدی باہر چلے گئے۔ اور مجھے اب یہ فکر دامنگیر ہوئی۔ کہ مبادا مولوی صاحب پکڑے گئے ہوں۔ اور اگر ایسا ہوا۔ تو مشکلات کا ایک اور نیا باب میرے واسطے کھل جائیگا۔ اور میرے خیالات کی رَو کا رُخ اب کسی دوسری جانب پھر گیا۔ اور میں اسی اُدھیڑ بن میں تھا۔ کہ والد صاحب کے تشریف لانے کی آہٹ آئی۔ میں ہوشیار ہوا۔ اور کسی خبر کے لئے ہمہ تن گوش ہوا۔ والدہ صاحبہ کے دریافت فرمانے پر والد صاحب نے سارا قصہ کہہ سنایا کہ مجھے کسی نے خبر دی تھی۔ کہ پٹوار خانہ کی طرف سے ایک اس رنگ و شکل کا مولوی گاؤں کی طرف بڑھتا ہوا دیکھا گیا تھا. مگر وہ بجائے گاؤں میں سے ہو کر جانے کے باہر باہر نکل گیا ہے۔ جس سے شبہ ہوا۔ کہ کوئی قادیان کا مولوی آیا ہوگا۔ آدمی تلاش میں دوڑائے مگر وہ ہاتھ نہیں آیا۔ ورنہ اس کو پتہ لگ جاتا۔ کہ ہمارے گاؤں میں کسی مُسلے کے آنے کا کیا مطلب؟ خوش نصیب تھا بچکر نکل گیا۔ اچھا ہے۔ ہمیں زیادہ ہوشیار کر گیا۔۔۔

یہ سنکر میری بھی جان میں جان آئی۔ اور اندر ہی اندر میں نے اللہ تعالےٰ کا شکرانہ ادا کیا۔ ورنہ میرے واسطے سخت مشکلات کا سامنا تھا۔ اگر خدانخواستہ مولوی صاحب پکڑے جاتے اور اُن کے قادیان سے آنے کا علم ہو جاتا۔ تو اُن لوگوں نے ضرور اُن کی توہین کرنی تھی جس کو میں قطعاً برداشت نہ کر سکتا۔ اور اسطرح نامعلوم کیا نتائج نکلتے اور کیا کیا تکلیف دہ حالات پیدا ہو جاتے۔ یہ صحیح ہے۔ کہ میں والد صاحب کا بہت ہی احترام کرتا تھا۔ اور اسی احترام کے باعث میں گونہ حد سے زیادہ دبا ہوا بھی تھا۔ اور اُن کے مونہہ چڑھنا یا اُن کا مقابلہ کرنا میرے واسطے ناممکن تھا۔ مگر اس میں بھی شک نہیں۔ کہ کسی کھلی توہین اور علی الاعلان تذلیل کو میں کبھی برداشت نہ کر سکتا۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی ستاری تھی۔ کہ ایسا موقعہ ہی پیدا نہ ہونے دیا۔ ع رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت والی بات بن گئی۔ مولوی صاحب موصوف کی یہ ملاقات خواہ وہ کتنی ہی دُور سے ہوئی۔ میرے لئے بڑی قوت و سکون اور تازگی کا باعث ہو گئی۔ اور قادیان سے دور ہونے کی وجہ سے اگر کچھ زنگ طبیعت پر لگا بھی تھا۔ تو اس ملاقات نے صیقل کا کام دیا۔ اور میرے دل میں اس مقدس بستی اور اس کے رہنے والوں خصوصاً اس کی رُوح رواں

کی ذات والاصفات سے وابستگی کا تعلق اور نیازمندی کے جذبات زیادہ سے زیادہ مضبوط ہوگئے۔ مولوی صاحب کا آنا گویا ایک قسم کی روحانی غذا تھی۔ جو اللہ کریم نے میرے لئے غیر متوقع طور سے اُس بیابان میں مہیا فرمادی۔

میرے والدین کے دل کو لگی ہوئی تھی۔ وہ دن رات اسی فکر میں غلطاں رہتے تھے۔ کہ کسی طرح سے میرے دل سے درخت ایمان کو کھود باہر پھینکیں۔ اور قادیان والوں کی یاد میرے دل سے محو کردیں۔ جس کے لئے وہ نت نئے سامان اور ارادہ سے کھڑے ہوا کرتے تھے اور ایک ہتھیار کو غیر مؤثر اور بیکار پاکر دوسرے کا استعمال شروع کردیتے تھے۔ اب انہوں نے بہت سی سوچ بچار کے بعد مجھے اپنے کام میں معاون بناکر بے حد مصروف کرکے میری توجہات کو دوسری طرف لگا دینے کا فیصلہ کیا۔ اور اپنی کمزوری، ہم وغم اور کثرتِ کار کے تذکرے میرے کانوں میں ڈال کر مجھے فرمایا۔ کہ میں اُن کے ساتھ کام میں مدد دیا کروں چنانچہ میں والد صاحب کے ساتھ گشت پر جانے لگا۔

گرداوری اور پیمائش کنے علاوہ اصول وارہ بندی اور زمیندار وحکّام سے میل ملاقات کے فرائض کی انجام دہی میں لگا رہا اور تھوڑے ہی دن کے بعد والد صاحب کو میں نے قریبًا فارغ کردیا۔ تنہا کام چلانے کے قابل ہوگیا اور چونکہ اس میں مجھے گونہ آزادی حاصل تھی۔ میں اپنے دینی فرائض کی تکمیل کے واسطے کافی موقعہ پاتا تھا۔ میں نے اس کام میں زیادہ ہوشیاری محنت اور انہماک وشغف کا ثبوت دیا جس سے والد صاحب بہت خوش اور متأثر ہوئے۔ اور میری قابلیت وواقفیت کا خود امتحان کرنے کے لئے اپنے ایگزیکٹو انجینیر بہادر کے روبرو پیش کرکے میرا امتحان دلا دیا جس میں مَیں کامیاب نکلا۔

کام میں پڑ جانے اور اس کے ذریعہ سے اصل مقصد کے حصول میں آزادی وسہولت میسر آجانے سے میری دلچسپی بڑھنے لگی۔ اور میں اس ذوق سے کام کرنے لگا۔ کہ اس میں رات دن اور گرمی سردی کا احساس بھی مجھے نہ رہتا۔ اور جب کام سے واپس گھر پہنچتا۔ والدین اور بھائی بہن مجھے ہاتھوں ہاتھ لیتے اور آنکھوں پر بٹھاتے اور خلاف معمول میری خاطر مدارات بلکہ عزت واحترام کا سلسلہ جاری ہوگیا۔ اور عجب نہ تھا۔ کہ شیطان اسی راہ سے کامیابی کا منہ دیکھ پاتا۔ اور ہوتے ہوتے اصل مقصد ومدعا میری نظروں سے اوجھل ہوجاتا۔ کیونکہ اس طرح مجھپر دنیا داری کا ایک رنگ چڑھنے لگا تھا۔ تعریف وتوصیف کی وجہ سے میرے خیالات کسی اور طرف کو بہنے لگے۔ اور اگرچہ میں نے زیادہ دلچسپی وانہماک اس کام میں ابتداءً محض فرائض دینی کی ادائیگی میں آزادی وسہولیت کے باعث دیا تھا۔ مگر اس میں بھی شبہ نہیں۔ کہ شیطان ایسے باریک در باریک رنگ اور نہاں در نہاں راہوں سے آرہا تھا۔ کہ اگر چندے اور یہی حالات رہتے۔ اور اللہ کریم غیب سے ہمیشہ کی طرح میری دستگیری وراہ نمائی کے سامان نہ فرماتے۔ تو میں اس زہر آلود انگبیں کو شیریں وشفابخش ہی یقین کرتے ہوئے نوش کرجاتا اور ہمیشہ کیلئے روحانی موت کی نیند سو جاتا۔ قریب تھا۔ کہ والد صاحب کی مساعی مجھے کوئی علیحدہ حلقہ دلا کر مستقل ملازمت دلانے میں کامیاب ہوجاتیں۔ کیونکہ میرے کام میں لگ جانے سے وہ بالکل فارغ اور مطمئن ہوکر افسران متعلقہ تک پہنچکر کوشش کرنے کیلئے فرصت پاتے تھے۔ اور میرے کام کی عمدگی اور شہرت کا چرچا دوسرے ذرائع سے بھی حکام بالا کے کانوں تک پہنچ چکا تھا۔ اس لئے اُن کی طرف سے والد صاحب کو ایسی امیدیں بھی دلائی جاچکی تھیں۔ مگر قربان جاؤں اپنے مولا کریم کے جس نے بچپنے ہی سے خود اپنی رحمت کے ہاتھوں میرے دل میں تخم ایمان بویا۔ خود ہی اُسے پودا بناکر ہمیشہ اس کی آبیاری فرمائی۔ اور ہر باد صرصر کے تھپیڑوں سے اپنا دست رحمت دیکر محفوظ رکھا۔ اور آج بھی اس نے اس سیل ضلالت سے اپنی قدرت نمائی کے ذریعہ بچا کر نجات دی۔ اور یوں ہوا۔ کہ اچانک حکام بالادست کی طرف سے والد صاحب کے تبادلہ کے احکام پہنچے اور دوسرے حلقہ میں پہنچکر چارج لینے کے لئے اتنا تھوڑا وقت دیا گیا۔ کہ کسی قسم کی کوشش کا موقعہ ہی نہ تھا۔ حکم حاکم مرگِ مفاجات والی بات۔ سرکاری ملازمت چون وچرا کی گنجائش نہ تھی۔ ناچار بادل ناخواستہ سفر کی تیاری کرنی پڑی۔ منزل دور تھی۔ اور سامان زیادہ۔ اس کے باندھنے بندھاتے ہی ایک دو روز لگ گئے۔

بیل گاڑیوں کا انتظام اور سواری کا سامان کرکے والد صاحب تو ایک تیز رو سواری لے کر نئے حلقہ کو روانہ ہوگئے۔ تاکہ وقت پر پہنچکر چارج لے سکیں۔ پیچھے انتظام میرے ایک عم زاد مجھ سے بڑے بھائی کے سپرد تھا۔ جو کچھ عرصہ سے کام سیکھنے کو میرے والد صاحب کے پاس آئے ہوئے تھے۔ وہ سخت متعصب اور کٹر ہندو ہونے کے علاوہ چونکہ شریک بھائی بھی تھے۔ لہٰذا ان کی میری اکثر چلتی ہی رہتی تھی۔ اور وہ عمومًا اپنے تعصب کے باعث میرے لئے بھاری روگ اور بڑی تکلیف کا موجب بنتے رہتے تھے اس سفر میں والد صاحب کی عدم موجودگی کے باعث ان کی وجہ سے مجھے بہت زیادہ تکالیف کا سامنا رہا۔ بات بات پر جھگڑا۔ بات بات پر اعتراض۔ میں کبھی مونہہ ہاتھ دھونے بیٹھوں تو جھٹ شکائت کہ ”دیکھو مسلمانی اس کے اندر سے نہیں نکلی۔ مسلمانوں کی طرح دونوں ہاتھ سے مونہہ دھوتا ہے۔ یہی نہیں تین تین بار دھوتا ہے۔ مسلمان بھی ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔ دیکھو تو کھانے سے پہلے مونہہ میں گنگنا کر بسم اللہ پڑھتا ہے۔ اور اگر بسم اللہ نہیں پڑھتا۔ تو جو کچھ پڑھتا ہے اونچا پڑھے۔ تاکہ ہمارا شبہ نکل جائے۔ جنگل جانے کا تو بہانہ ہوتا ہے۔ وہ تو پیچھے رہ کر نماز پڑھتا ہے۔ بھلا جنگل جانے میں بھی اتنی دیر لگا کرتی ہے۔ اور وہ اتنی دور کیوں نکل جاتا ہے۔ کہ کوئی دیکھ نہ سکے۔“

غرض تین رات اور دو دن کا سفر قریبًا ایسی ہی مشکلات میں کٹا۔ والدہ کو ایسی باتوں سے تکلیف ہوتی اور دوسرں کو بھی۔ اور اسطرح جھگڑا شروع ہوجاتا۔ زنانہ ساتھ تھا۔ بیل گاڑیوں کا سفر، راستہ بھی خراب تھا۔ اور اکثر جگہ نہر کے پانی کی وجہ سے بہت ہی تکلیف دہ حالات پیش آتے رہے راستہ میں کئی مرتبہ ان کی میری دو بدو ہاتھا پائی اور لاٹھی سوٹے تک بھی نوبت پہنچی۔ آخر خدا خدا کرکے نئے حلقہ کے حدود آئے جہاں والد صاحب خود معہ چند کسانوں کے موجود تھے۔ دور سے والد صاحب اور ان کے ساتھ مسلمان کسانوں کو دیکھ کر میرے اندر خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اور راستہ کی کوفت اور ناخوشگوار حالات بھول گئے۔ ہم لوگ رات کے اندھیرے میں ہیڈ کوارٹر پہنچے۔ جو موضع لدھڑ میں تھا۔ اور پڑوپیاں۔ بہلول پور کے علاوہ دو ایک اور گاؤں اس حلقہ میں شامل تھے۔ جو سارے کے سارے ہی پہلے حلقہ کے برخلاف کلّیتہً مسلمان زمیندار اور مزارعان کے تھے یہ علاقہ سانگلاہل ریلوے اسٹیشن سے ملحق بلکہ ایک ریلوے سٹیشن سالاروالا نام خود اس حلقہ کے اندر واقعہ تھا۔

نیا حلقہ نئے لوگ اور نئے ہی حالات اوّل اوّل تو کچھ عرصہ اجنبیت ہی میں گزرا۔ مگر جب تعارف ہوا۔ تب بھی جو خیال دل میں مسلمان شکلوں کو دیکھنے سے پیدا ہوتا تھا۔ غلط نکلا۔ لوگ واقعی مسلمان کہلاتے تھے۔ نام بھی اُن کے مسلمانوں کے سے تھے۔ بڑے بڑے قدآور لمبے چوڑے اور شکیل جوان تھے۔ اچھے اچھے خوبصورت اور سجے پھبے چوڑے حقّے ہر وقت اُن کے رفیق اور اُن کی مجالس کی رونق بنتے تھے۔ لدھڑ خاص میں ایک مسجد تھی۔ ملّاں بھی مقرر تھے۔ مگر جتنا عرصہ میں وہاں رہا میں نے اُن لوگوں میں مندرجہ بالا علامات کے سوا اور کوئی علامت اسلام کی دیکھی نہ اتنے عرصہ میں کبھی اذان کی آواز ہی میرے کان میں پڑی۔ وہ لوگ مسلمان کہلاتے تھے۔ مگر افسوس کہ اُن کے اعمال مومنانہ نہ تھے۔ بلکہ وہ خادم اسلام کہلانے کی بجائے اسلام فروش کہلانے کے مستحق تھے۔ اور جیساکہ میں آگے چل کر اپنے موقعہ پر بیان کرونگا۔ میرے بعض بزرگوں کے ساتھ ملکر مسلمان کہلاتے ہوئے مجھے مسلمان یقین کرتے ہوئے پکڑ کر دشمنانِ اسلام کے حوالے کرنے کی غرض سے قادیان تک بھی پہنچے تھے مگر اللہ کریم نے اس موقعہ پر بھی اپنے خاص ہی فضل سے مجھے ان ظالموں کے پنجے سے نجات دیکر محفوظ رکھا۔ اور ان کو ناکام ونامراد اور نادم وشرمندہ ہوکر خالی ہاتھ واپس آنا پڑا۔ ان لوگوں نے نہائت ہی ادنیٰ دنیوی خیالی فائدہ کی خاطر جو ایک پٹواری نہر کی مہربانی سے ان کو پہنچنے کی توقع تھی۔ ایک مسلمان مرد کو اسلام سے مرتد کرنے تک میں مدد دینے سے دریغ نہ کیا۔ پس مجھے تو اُن کے اسلام کی اس سے زیادہ کوئی خصوصیت یاد نہیں۔

قادیان سے نکلے مجھے کئی ماہ گذر چکے ہیں۔ کوچہ ہائے قادیان میری نظروں میں اور دارالامان کے مقدسین اور اُن کے آقا وہادی کی پاک شکلیں میرے دل میں ہیں۔

صبح کی سیر اور شام کا دربار میری یاد میں ہے۔ مگر افسوس سبھی خاموش ہیں۔ نہ کوئی محبت بھری سُریلی آواز کان میں پڑتی ہے۔ اور نہ ہی کوئی مقدس ہستی مجھ سے مخاطب ہو کر مجھے کچھ فرماتی ہے اور یہ خموشی وسکوت کا سماں عالمِ خواب کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے دل ایک تپش اور خلش محسوس کرنے لگتا ہے۔ اور اس دوری اور ہجر وفرقت کی لمبی گھڑیاں اب بے قرار کئے دیتی ہیں۔ اب یہ جدائی اتنی لمبی اور اتنی بوجھل معلوم دیتی ہے۔ کہ اس کا خیال بھی دل میں درد وکرب پیدا کرنے لگا ہے۔ دل اچھلتا ہے۔ اور روح پرواز کرتی ہے۔ ہو سکے تو اڑ کر قادیان پہنچا چاہتا ہوں۔ مگر بے بس ہوں۔ کوئی یار نہ مددگار۔ وسیلہ ہے نہ ہتھیار، جس کی مدد سے میں ان سنگین و آہنی زنجیروں کو توڑ کر اڑ جاؤں۔ اور اپنے روحانی بسیرے میں جا ڈیرہ ڈالدوں انسانوں میں سے کوئی ایک بھی اپنا ہمخیال و ہمنوا نہیں جس سے دل کی کہوں۔ اور مدد کا طلبگار بنوں۔ آجا کے صرف اور صرف ایک ہی ذات ہے۔ جس کی طرف نگاہ اٹھتی اور رُوح فریاد کیلئے پرواز کرتی ہے۔ جب کبھی موقعہ ملتا اور تنہائی میسّر آ جاتی ہے جی کھول کر عرض ومعروض کر لیتا ہوں۔ ورنہ دل ہی دل میں گریہ وبکا اور فریاد وانتجا کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ دلی کیفیات کتنی بھی چھپائی جائیں، ظاہر ہو کر ہی رہتی ہیں۔ اور قلبی حالات کا کچھ نہ کچھ اثر بشرہ پر ضرور ہی نمایاں ہو جاتا ہے۔ والدین ان حالات سے بے خبر نہیں۔ بلکہ میری دلی حالت کو میرے چہرے سے پڑھ لیتے ہیں۔ اور پھر سے میری طرف متوجہ ہو کر مجھے دنیوی کاموں میں ڈالکر میری توجہ کو پھیر دینے کی فکر کرتے ہیں۔ اولاً والدہ محترمہ کے ہمرکاب ایک لمبے اور کٹھن سفر کی صعوبتوں میں ڈالا جاتا ہے جو متواتر ایک عشرہ جاری رہا۔ اور جس کی سختی وشدت کا اندازہ ان الفاظ سے کیا جا سکتا ہے۔ جو والدہ محترمہ کی زبان سے نکلتے ہوئے آج بھی میں اسی طرح سن رہا ہوں۔ جس طرح کہ اُن دنوں سنتا تھا۔

"آپے ای مرجان گے جو جیٹھ ہیں گے راہ۔"

یعنی جیٹھ کے مہینے کا سفر موت کے مونہہ میں جانے کے برابر ہوتا ہے۔ اور اسی مقولہ سے میں اندازہ کیا کرتا ہوں۔ کہ مئی جون سنہ ۱۸۹۶ء کا یہ واقعہ ہے۔ اس سفر میں والدہ محترمہ مجھ سے بہت خوش ہوئیں۔ اور میری خدمات، فرمانبرداری جفاکشی اور دلبری کا ان کے دل پر خاص اثر ہوا۔ جس کے نتیجہ میں وہ مجھ پر خاص شفقت کرنے لگیں۔ اور بارہا میری ان خدمات کا ذکر کر کے ایک آہ سرد بھر لیا کرتی تھیں۔ کہ ایسا شیر بچہ کس مرض (عشق اسلام) میں مبتلا ہو گیا ہے۔ یہ سفر سانگلہ سے چونیاں تک آمد ورفت کا تھا۔ جو خطرناک ویرانے جنگلوں کے باعث اور واپسی پر بعض چور اور ڈاکوؤں سے مقابلہ ہو جانے کی وجہ سے واقعی نہائت ہی بھیانک تھا۔ جو محض اللہ تعالےٰ کے فضل سے بخیریت سرانجام ہوا۔ مجھے اب قادیان پہنچنے کی جلدی ہے۔ زیادہ صبر کی اب مجھ میں طاقت نہیں۔ دل اداس اور جی گھبرایا ہوا ہے۔ لہٰذا میں واقعات کی تفاصیل کو چھوڑتا ہوا صرف اشاروں پر اکتفا کروں گا۔ اور بہت ہی مختصر کر کے لکھونگا۔ تاکہ جلد تر پھر مجھے دارالامان پہنچکر اپنے آقا کی قدمبوسی کا شرف مل سکے۔ اور میری روحانی پیاس اور روح کی تڑپ مٹے۔

والد صاحب نے مجھے پھر اسی اپنے کام میں لگا لیا۔ اور میں بھی کرنے لگا۔ والد صاحب کی وہی کوشش اور وہی خواہش تھی۔ کہ جس طرح بھی بن پڑے۔ مجھے ملازمت کے جال میں پھنسا کر جکڑ دیں۔ اتفاق سے سانگلاہل سے اوپر تھوڑے فاصلہ پر بڑی نہر میں ناکہ پڑ گیا۔ چونکہ ناکہ رات کے اندھیرے میں پڑا تھا۔ کسی کو خبر نہ ہوئی۔ اور وہ اتنا بڑھ گیا۔ کہ بیسیوں دیہات سے مدد منگانی پڑی۔ والد صاحب کو بھی اطلاع ملی۔ کہ زیادہ سے زیادہ مدد لے کر فوراً پہنچیں۔ انہوں نے ایک طرف مجھے بھیجا۔ دوسری طرف میرے عمزاد بھائی کو۔ اور خود بھی دوڑ بھاگ کرنے لگے تینوں کی دوڑ دھوپ اور کوشش سے ہماری مدد جہاں جلد تر موقعہ پر جا پہنچی وہاں تعداد میں بھی بہت زیادہ تھی۔ تمام بڑے بڑے آفیسر موقعہ پر موجود تھے۔ اس چستی سے خوش ہوئے۔ دن بھر نہائت محنت سے کام جاری رہا نہر کا ہیڈ بند کرا دیا گیا۔ اور اوپر کی شاخوں میں پانی زیادہ کر کے پانی کا زور توڑنے کی کوششیں کی گئیں۔ ہزاروں آدمی کام پر تھے۔ دن بھر کی محنت اور شائد ہزاروں ہی بوریوں کے ریت سے بھر کر ناکہ میں ڈال دینے سے یہ امید لگی کہ خطرہ پر قابو پا لیا گیا ہے۔ شام کو جائزہ لیا گیا۔ افسروں کی طرف سے خوشنودی کا اظہار کیا گیا۔ اور اس موقعہ پر میرے والد صاحب پر میری وجہ سے خاص ہی نظر عنائت ہوئی۔ مجھے کام کرتے اور کراتے دیکھ کر انگریز اور دیسی افسران تک نے تعجب کیا۔ اور دریافت کرایا۔ کہ یہ لڑکا کون ہے۔ والد صاحب کی طرف نسبت لازمی تھی شام کو رخصت کرتے وقت افسر اعلیٰ نے دس روپے کا نقد انعام مجھے دیکر خوشنودی کا اظہار کیا۔ اور اسطرح میرے والد صاحب بہت خوش اور کامیاب واپس اپنے حلقہ کو آئے۔

والد صاحب محترم کو پہلے حلقہ سے اچانک اور غیر متوقع تبدیلی کا جہاں دنیوی اور مادی فوائد سے محروم ہو جانے کی وجہ سے رنج وصدمہ تھا کیونکہ وہ حلقہ اس لحاظ سے کئی ایک خصوصیات رکھتا تھا۔ اور وہاں والد صاحب نے ایک گہرا اثر اور بھاری رسوخ بھی پیدا کر لیا تھا۔ وہاں ان کو میرے متعلق جو امیدیں لگی ہوئی تھیں اُن سے محروم ہو جانے کا اور بھی زیادہ افسوس تھا۔ اس تازہ حادثۂ نہری کے نتائج جس رنگ میں رونما ہوئے اس سے اُن کو پھر سے امید کی جھلک دکھائی دینے لگی۔ اور انہیں اپنا مقصود قریب نظر آنے لگا۔ دس روپے کی رقم تو واقعی اُن کے لئے چنداں قابلِ التفات نہ تھی۔ مگر اُن کا اور میرے نام کا یوں افسروں کے کانوں تک پہنچ جانا اور ہمارے کام کا اُن کی نظروں میں چڑھ کر قابلِ انعام سمجھا جانا۔ اُن کو اپنی کامیابی کا یقین دلانے والا ضرور تھا۔ چنانچہ انہوں نے یہاں بھی ایک مرتبہ ان حالات سے فائدہ اٹھانے اور افسران بالا سے میرے متعلق سفارشات حاصل کرنے کی کوشش کی جس میں اُن کو گونہ کامیابی بھی ہوئی۔ مگر باقاعدہ امتحان پاس کرنے کی شرط ساتھ تھی جس کا والد صاحب کو چنداں خیال نہ تھا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ میں اس امتحان کو بآسانی پاس کر لونگا۔ چنانچہ والد صاحب نے مجھے میرے عمزاد بھائی اور دو ایک اور امیدواروں کے ساتھ گوجرانوالہ بھیج دیا۔ جہاں ان دنوں ایسے امیدواروں کا باقاعدہ امتحان ہوتا تھا۔ مگر مصلحت الٰہی کہ وہاں پہنچ کر سب سے پہلے مڈل پاس کرنے کی سند کا مطالبہ ہوا۔ جو میرے پاس نہ تھی۔ کیونکہ میں مڈل کے امتحان میں ناکام ہو چکا تھا۔ اس طرح مجھے اس امتحان میں شمولیت کی اجازت نہ ملی۔ اور میں جوں کا توں واپس آ گیا۔ اور میری اسطرح ناکام واپسی والد صاحب کو طبعًا ناگوار گذری۔

کل کائنات عالم بلکہ اس کا ایک ایک ذرہ میرے خالق و مالک خداوند خدا کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ وہ چاہے جدھر اس کا رُخ پھیر دے۔ آسمانوں اور زمینوں اور ان کے درمیان کی تمام اشیاء وہ جمادات ہیں یا نباتات وحیوانات آسمانوں کی انتہائی بلندیوں پر ہیں یا زمین کی اتھاہ گہرائیوں کے نیچے تمام کی تمام اپنی خواص سمیت اسی کی مخلوق، اُسی کی مملوک اور اسی کے قبضۂ تصرف میں ہیں جس کی خدمت میں چاہے اُن کو لگا دے۔ اور جس کے لئے چاہے اُن سب کو سر بسجود کر دے۔ دنیا کے بلند ترین پہاڑ اس کی جبروت کے سامنے لرزاں اور بے پناہ و اتھاہ موّاج بحار ذخّار اس کی سطوت کے سامنے پرسکون اور خاموش۔ ہر قسم کی کثیف و درندہ صفت مخلوق اور زہریلی کائنات اس کے اشارہ وحکم کی پابند ہر قسم کی لطیف مخلوق کیا نوری اور کیا ناری ساری کی ساری اس کے احکام کی تعمیل کے لئے دست بستہ و کمر بند۔ عناصر اربعہ کیا ہوا اور کیا آگ، کیا پانی اور کیا خاک سبھی اس کے حکم کے بندے ہیں۔ اور نہ صرف یہی بلکہ وہ مخلوق بھی جس کی خاطر یہ سب کچھ پیدا کیا گیا۔ اور یہ سارے سامان جمع کئے گئے اور آسمان تک پر بادشاہت کرنے کی توفیق اُسے ودیعت کی گئیں سورج چاند اور ستاروں کو اس کے لئے مسخر کر دیا گیا۔ اور فرشتوں تک کو اُسے سجدہ کرنے اور اس کی فرمانبرداری کا حکم دیا گیا۔ وہ اشرف المخلوقات بھی خدا کی عزت وعظمت اس کی کبریائی اور جبروت اس کی قدرت وہیبت کے سامنے ویسی ہی بے بس وترساں ہے جیسے ایک ننھی سے کیڑی یا نہائت حقیر سا مچھر۔ وہ کسی حرکت یا سکون کا مالک نہیں اور اپنی مرضی وارادہ میں خدا کی مرضی واذن کا ویسا ہی پابند ہے جسطرح کوئی ایک پتہ اپنی حرکات میں یا کوئی ذرہ اپنے خواص کے اظہار میں۔ انسان باوجود اپنی اتنی خداداد عزت وعظمت اور رتبہ ومنزلت کے اپنے دل

سمیت جس کو عرش الہٰی بننے تک کی عزت ملی۔ باوجود اس بزرگی کے کلی طور پر خداوند خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اور جدھر وہ چاہے اس کو پھیر دیتا ہے۔ اور جو کام چاہے اُس سے کرالیتا ہے۔

والدین نے میرے دل کو اسلام سے پھیرنے اور مجھے مرتد بنانے کے لئے جو کچھ کیا۔ وہ اتنا زیادہ تھا۔ کہ اگر انسانی کوشش ہی پر سارے تغیرات کا انحصار ہوتا۔ تو وہ نہ صرف مجھی کو مغلوب کر کے اپنا دل ٹھنڈا کر لیتے۔ بلکہ بہت ممکن تھا۔ کہ مسلمانوں سے بدلہ لینے کی غرض سے مرتدین کی ایک فوج بنا لیتے۔ مگر حقیقت یہی ہے۔ کہ انسانی مساعی کو باثمر و بارور کرنا اور دلوں کو کسی چیز پر قائم رکھنا یا اس سے پھیر دینا، کسی بات میں اثر پیدا کر کے دلوں کو اس کے قبول کرنے کے لئے تیار کرنا۔ یا اس کو بے اثر بنا کر لوگوں کو اس سے متنفر کر دینا۔ الغرض تاثیر پیدا کرنا یا غیر مؤثر بنانا اللہ تعالےٰ ہی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ وہی دلوں کے باریک در باریک اور نہاں در نہاں بھیدوں سے واقف اور مصرّف القلوب ہے۔ میرے والدین کی تمام مساعی کو اس نے بے اثر بنا کر مجھے اُن کے بداثرات سے بچایا۔ اور میرے قلب کو اُسی نے وہ حلاوتِ ایمان بخشی جس کے بعد ایمان کی دولت سے دور ہو جانے کی نسبت ہزار موت بھی آسان ہو جاتی ہے۔ ان کے سارے سامانوں کو بے کار بنایا۔ تو اسی ذات والاصفات نے ورنہ میں بالکل ایک کمزور بچہ تھا۔ کوئی دلیل تھی میرے پاس نہ برہان۔ جس سے اُن کا مقابلہ کر سکتا۔ صرف اور صرف اُسی غیب در غیب ہستی کا پوشیدہ ہاتھ تھا۔ جس نے ہر نازک ترین مرحلہ پر خود میری حفاظت فرمائی۔ اور دل میں وہ نور ڈالا۔ جو حق و باطل میں تمیز کا موجب بنتا رہا۔ اور ہر موقعہ پر مجھے تسلّی و اطمینان اور قوت و ثبات بخشتا رہا۔ میری کوئی ذاتی قابلیت نہ تھی۔ بلکہ سراسر میرے آقا و مالک ہی کا فضل تھا۔ جسنے راہنمائی بھی فرمائی اور ہمیشہ دستگیری بھی کی۔

اے اللہ! ہمیشہ کی طرح آئندہ بھی فضل فرما۔ اور میرا انجام بھی اپنی رضا پر بخیر فرما۔ آمین۔

والدین کسی خیال میں تھے۔ مگر میرا خدا کسی اور ہی خیال میں تھا۔ اُن کی تدبیریں کچھ چاہتی تھیں۔ مگر خدا کی تدبیر کچھ اور ہی کرنے والی تھی۔ گجرانوالہ سے خلاف امید میری ناکام واپسی کا والد صاحب پر گہرا اثر ہؤا۔ اور وہ ابھی کچھ فیصلہ کرنے نہ پائے تھے۔ کہ گھر کی کسی ضرورت کے ماتحت گھر میں کسی بڑی بوڑھی ہمقوم بلکہ اپنی کسی رشتہ دار کی ضرورت لاحق ہوئی۔ گھر میں میرے عمزاد بھائی کے علاوہ میرے ایک دور نزدیک کے رشتہ سے چچا بھی موجود تھے۔ ان کو بھیجکر پھوپھی یا دادی صاحبہ (رشتہ کی دادی نہ کہ حقیقی) کو منگایا جا سکتا تھا۔ مگر قربان جاؤں اپنے آقا پر جو سچ مچ مسبب الاسباب اور مصرّف القلوب بھی ہے۔ نہ معلوم اُس نے والدین کے دل دل میں کیا ڈالا۔ کہ انہوں نے میرے عمزاد بڑے بھائی اور چچا صاحب کو چھوڑ کر پھوپھی یا دادی کو لانے کا قرعہ میرے نام نکلوا دیا۔ بھائی بہت متعصب تھے۔ انہوں نے روک بھی ڈالی۔ اگرچہ اپنا نام تو پیش نہ کیا۔ چچا صاحب کو بھیجنے کا مشورہ دیا۔ مگر درحقیقت ان کی اپنی خواہش تھی۔ کہ وہ جائیں، وطن بھی اُدھر ہی تھا۔ گھر والوں سے بچھڑے عرصہ گذرا تھا۔ ایک پنتھ دو کاج، ایک تیر سے دو شکار کرنے کا خیال تھا۔ مگر خدا تعالےٰ نے والدین کے دل کو نہ پھرنے دیا۔ اور انہوں نے میرے ہی جانے کا فیصلہ کر کے مجھے روانگی کا حکم دیدیا۔ ضروری ہدایات اور مناسب سامان دیکر رخصت کیا۔ میں نے سانگلاہل ریلوے اسٹیشن سے سوار ہونا تھا اور چونکہ والدین کے اس فیصلہ کے ساتھ ہی میرے دل نے بھی کچھ فیصلہ کر لیا تھا۔ اپنے ساتھی کو جو گھوڑی لے کر مجھے اسٹیشن تک پہنچانے گیا تھا۔ اسٹیشن سے اِدھر ہی رخصت کر دیا۔ تاکہ اس کو یہ علم ہی نہ ہو سکے۔ کہ میں نے ٹکٹ کہاں کا لیا ہے۔ گاڑی آنے والی تھی۔ ٹکٹ بٹ رہے تھے۔ میں بھی بڑھا۔ اور سیالکوٹ کا ٹکٹ لے کر بسم اللہ مجرھا ومرسھا کہتا ہؤا سوار ہو گیا۔

خدا کے فضل سے سیالکوٹ پہنچا۔ مسجد میں گیا۔ حضرت میر حامد شاہ صاحب اور اپنے واقفکاروں دوستوں سے ملکر رات گذاری۔ اور پھر اللہ کے بھروسے پر قادیان دارالامان کا قصد کیا۔ اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی طور پر اور خارق عادت رنگ میں غیب سے میری حفاظت وامداد کے سامان کئے۔ اور یوں پھر کم و بیش ۹ ماہ بعد مجھے دارالامان میں سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود مہدی معہود علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے قدوم میمنت لزوم میں لا ڈالا۔ الحمد للہ۔ الحمد للہ۔ الحمد للہ ثم الحمد للہ علیٰ ذالک۔ الحمد للہ الذی ھدانا لھٰذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

جولائی ۱۸۹۶ء کا آخر یا اگست ۱۸۹۶ء کا ابتدائی حصّہ ہوگا۔ جب خدا تعالیٰ نے دوبارہ قدرت نمائی سے مجھے زندہ کیا۔ اور محض اپنے فضل سے دارالامان پہنچایا میں اُسی زمانہ سے اس واقعہ کو اپنی نشأۃ ثانیہ یقین کرتا رہا ہوں۔

والدین نے مجھے اپنی خاص ضرورت کے ماتحت اہم ضروری کام کے لئے بھیجا تھا۔ مجھے افسوس ہے اور ہمیشہ سے ہی رہا ہے۔ کہ میں نے ان کو سخت تکلیف پہنچائی جس کی تلافی میرے لئے ممکن نہیں۔ میں اُن سے بھی شرمندہ ہوں۔ اور اپنے پیدا کرنے والے سے بھی نادم ہوں۔ کہ آڑے وقت میں مَیں والدین کے کام نہ آسکا۔ اور ان کو سخت انتظار اور پھر سخت تکلیف میں مبتلا کرنے کا موجب بنا۔ مگر کیا کروں، میرا خدا جو میرے دل کی گہرائیوں سے بھی واقف ہے۔ خوب جانتا ہے۔ کہ میں ایسا کرنے میں معذور تھا۔ نہیں بلکہ حق بجانب تھا۔ میں اگر کسی دنیوی طمع اور مال و زر کی لالچ میں ایسا کرتا یا کسی نفسانی خواہش کی پیروی میں یہ کچھ مجھ سے سرزد ہؤا ہوتا تو واقعی مستوجب صد لعنت تھا۔ اور اس صورت میں دنیا جہان میں میرا کوئی ٹھکانہ ہوتا نہ میں کسی شریف انسان کو یہ مونہہ دکھانے کے قابل رہتا۔ مگر میرا خدا جانتا ہے۔ کہ میں نے جو کچھ کیا یا مجھ سے جو کچھ سرزد ہؤا۔ وہ ایسی ایک قسم کی خود رفتگی میں ہؤا۔ جس میں میری کوشش کا کوئی دخل نہ تھا۔ بلکہ اس کے لئے سارے ہی سامان خود خدا نے غیب سے مہیّا کئے اور جس نیت و غرض سے میں نے یہ کام کیا۔ اس کے مقابلہ میں اگر ہزار والدین اس کام سے روکنے والے قربان بھی کر دیئے جاتے تو مجھ پر الزام نہ تھا۔ کیونکہ خدا اور اس کے دین کے مقابلہ میں ان جسمانی والدین کی ہستی ہی کیا ہے۔ جو خدا اور اس کے دین سے اولاد کو روک رکھیں۔ مگر باوجود اس ایمان کے میں والدین کی اس تکلیف کا احساس دل میں پاتا رہا ہوں۔ اور اب بھی محسوس کرتا ہوں۔ اور جہاں تک مجھ سے بن پڑا ہے میں نے دنیوی رنگ میں اُن سے حسن سلوک اور خدمت کے ذریعہ سے اُن کے دل سے اُن اثرات کو مٹانے کی کوشش کی ہے۔ اور میں سعادت و فخر محسوس کرتا ہوں۔ کہ والدین باوجود اتنے بھاری اختلاف اور اتنے سخت صدمہ کے بعد میں مجھ سے خوش ہو کر راضی بقضاء ہو گئے تھے۔ اور اکثر میرے پاس آتے۔ اور مہینوں خوشی خوشی ٹھہرتے رہے ہیں۔

نہ صرف والدین بلکہ دوسرے رشتہ دار بھی ہمشیرگان اور بھائی بہنوئی اور بھتیجے اور بھانجے بھانجیاں آتے اور ملتے ملاتے رہے۔ اور میں سمجھتا ہوں۔ کہ اس لحاظ سے بھی میں ان کی طرف سے شرمندہ نہیں۔ اور اپنے خدا سے بھی امیدوار ہوں۔ کہ وہ مجھ سے خوش ہو کر مجھے سُرخروئی نصیب فرمائیں گے۔ آمین اللّٰھم آمین۔

ضروری اعلان

اس لطیف مضمون کا دوسرا حصّہ جو بہت اہم اور نہایت دلچسپ حالات پر مشتمل ہے۔ وہ سیرت نمبر کے بعد انشاء اللہ شائع کر دیا جائیگا

"ایڈیٹر"

وصیتیں

نمبر ۵۰۱۷

منکہ بھاگ بھری زوجہ ملک عطاء اللہ صاحب قوم اعوان عمر ۴۵ سال تاریخ بیعت مارچ سنہ ۱۹۳۸ء ساکن دوالمیال ضلع جہلم۔ بقائمی ہوش وحواس بلاجبر واکراہ آج بتاریخ ۲۱ ۳/۳۸ حسب ذیل وصیت کرتی ہوں۔ میری اس وقت مندرجہ ذیل جائداد ہے۔

حق مہر بذمہ خاوند	۵۰۰/-
چوڑیاں طلائی	۱۱۰/-
کانٹے طلائی	۹۰/-
	۷۰۰/-

میں اس کل جائداد مالیتی ۷۰۰/- روپے کے ۱/۸ حصہ کی وصیت کرتی ہوں۔ اگر میری وفات کے بعد اس کے علاوہ کوئی اور جائداد ہو۔ تو اس کے بھی ۱/۸ حصہ کی مالک صدر انجمن احمدیہ قادیان ہوگی۔ اور اگر میں کوئی رقم یا حصہ جائداد صدر انجمن احمدیہ قادیان میں بمد وصیت داخل کردوں۔ تو ایسی رقم یا جائداد کی قیمت زر وصیت سے منہا کردی جائے گی۔

الامۃ:۔ بھاگ بھری بقلم خود۔

گواہ شد۔ عطاء اللہ بقلم خود خاوند موصیہ۔

گواہ شد:۔ محمد امیر عفا اللہ عنہ بقلم خود

گواہ شد:۔ محمد اسلم بی۔ اے۔ بقلم خود؛

نمبر ۵۰۲۵

منکہ مسماۃ اللہ جوائی زوجہ مرزا غلام نبی قوم مغل عمر تقریباً ۲۴ سال تاریخ بیعت سنہ ۱۹۱۳ء ساکن ہریا والہ ضلع گوجرانوالہ بقائمی ہوش وحواس بلاجبر واکراہ آج بتاریخ ۱۳ اپریل سنہ ۱۹۳۸ء حسب ذیل وصیت کرتی ہوں۔

اس وقت میری جائداد ایک مشین سلائی کی مالیتی ۷۵ روپے ہے۔ اور رقم حق مہر جو ابھی واجب الادا ہے مبلغ ۳۲ روپے ہے۔ اس کے علاوہ ایک جوڑی کانٹے طلائی وزنی ۳ ماشہ قیمتی نو روپیہ ہے۔ اس کے دسویں حصہ کی صدر انجمن احمدیہ قادیان کے حق میں وصیت کرتی ہوں۔ اس کے متعلق اگر کوئی رقم میں اپنی زندگی میں صدر انجمن احمدیہ قادیان کو ادا کردونگی۔ تو وہ اس میں سے وضع کردی جائے۔ اور اگر میری وفات پر اس جائداد کے علاوہ کوئی اور جائداد میری ثابت ہو۔ تو اس کے ۱/۱۰ حصہ کی بھی صدر انجمن احمدیہ قادیان مالک ہوگی؛

[illegible]:۔ اللہ جوائی۔

گواہ شد۔ غلام نبی خاوند موصیہ

گواہ شد۔ غلام قادر شیخ، گوجرانوالہ

گواہ شد۔ عبد القادر پلیڈر گوجرانوالہ

نمبر ۵۰۲۵

منکہ حکیم محمد یعقوب نجیب آبادی ولد حافظ محمد ابراہیم صاحب قوم شیخ پیشہ طبابت عمر ۳۴ سال تاریخ بیعت نومبر سنہ ۱۹۲۷ء ساکن مہاجر قادیان حال وارد لاہور ڈاکخانہ وطن بلڈنگ ضلع لاہور۔ بقائمی ہوش وحواس بلاجبر واکراہ آج بتاریخ ۲۲ ۳/۳۸ حسب ذیل وصیت کرتا ہوں۔

میری جائیداد اس وقت کوئی نہیں۔ میرا گذارہ طبابت پر ہے۔ لیکن چونکہ ابھی کام کی ابتداء ہے۔ میں اپنی صحیح ماہوار آمد کا اندازہ نہیں کرسکتا۔ لیکن جسقدر بھی میری ماہوار آمد ہوگی۔ میں تازیست اپنی ماہوار آمد کا آٹھواں حصہ ادا کرتا رہونگا۔ انشاء اللہ العزیز

میرے مرنے کے وقت جسقدر جائیداد ثابت ہو۔ اُس کے آٹھویں حصہ کی مالک صدر انجمن احمدیہ قادیان ہوگی۔

العبد:۔ حکیم محمد یعقوب طبیب احمدی بقلم خود
مسجد احمدیہ لاہور بیرون دہلی دروازہ

گواہ شد:۔ عبد الکریم بقلم خود سیکرٹری مال

گواہ شد:۔ نواب دین سیکرٹری وصایا لاہور

نمبر ۵۰۲۱

منکہ بشیر احمد ولد چوہدری چراغ دین نمبردار قوم ارائیں پیشہ زمینداری عمر ۱۹ سال پیدائشی احمدی ساکن گوکھووال چک نمبر ۲۷۶ رکھ برانچ ڈاکخانہ چک نمبر ۲۷۵ گرنیارپور ضلع لائلپور بقائمی ہوش وحواس بلاجبر واکراہ آج بتاریخ ۴/۳۸ ۱ حسب ذیل وصیت کرتا ہوں۔

میری جائیداد کوئی نہیں۔ اس وقت میری ماہوار آمد بشکل وظیفہ عـہ روپے ہے۔ میں تازیست ماہوار آمد کا ۱/۸ حصہ داخل خزانہ صدر انجمن احمدیہ قادیان کرتا رہوں گا۔ میرے مرنے کے وقت میری جس قدر جائیداد ثابت ہو۔ اس کے ۱/۸ حصہ کی مالک صدر انجمن احمدیہ قادیان ہوگی۔ پچھلے چار سال کا وظیفہ یکمشت ۱۲ اعـہ روپے ملا ہے۔ اس کے ۱/۸ حصہ کے حساب سے ۱/۲ عـہ روپے ادا کرتا ہو۔ باقی جب تک ملتا رہے گا ماہوار ادا کرتا رہوں گا۔

العبد:۔ چوہدری بشیر احمد بقلم خود

گواہ شد:۔ ملک بشیر احمد کواپرٹیو ڈیپارٹمنٹ
شاہدرہ ضلع شیخوپورہ

گواہ شد۔ حکیم محمد صدیق سیکرٹری مال
شاہدرہ ضلع شیخوپورہ

گواہ شد:۔ چراغ دین والد موصی

"الحکم" کی توسیع اشاعت ہر احمدی کا فرض ہے

کونین کے ذریعہ ملیریا کا مختصر طریق علاج

ملیریا کا کونین کے ذریعہ مختصر علاج جو ملیریا کے انسداد کا ایک نیا پہلو ہے۔ محض تجرباتی طور پر معلوم کیا گیا ہے۔ اور کئی سال کے امتحانی تجربات کے بعد اُسے عملی طور پر استعمال کیا جانے لگا ہے۔ ڈچ ایسٹ انڈیز اور یونان کے سرکاری طبی محکمے عرصہ سے کامیابی کے ساتھ اسے استعمال میں لا رہے ہیں۔

یہ طریق علاج اقتصادی لحاظ سے نہایت مفید ہے۔ خصوصًا ایسے ممالک میں جہاں کاشتکار مزدور بکثرت آباد ہوں۔ چنانچہ پانچ سے سات دن تک روزانہ ۱۵ سے ۲۰ گرین کونین سلفیٹ کی خوراک کے استعمال پر کچھ زیادہ خرچ نہیں ہوتا۔ اور مزدور جلد بخار سے صحت یاب ہوتے ہیں۔ اور اس طرح انہیں بیماری میں زیادہ دن ضائع کرنے نہیں پڑتے۔

سماٹرا کے اسٹیٹ ہسپتال جو کئی سالوں سے اس مختصر طریق علاج کو استعمال کر رہے ہیں۔ مذکورہ بالا بیان کی صداقت کے شاہد ہیں۔ پیٹرک (بلغاریہ) کے ملیریا اسٹیشن نے ثابت کیا ہے۔ کہ جن بیماروں کو تین سے چار روز تک پندرہ گرین کی خوراک دی جاتی ہے۔ (بچوں کی خوراک ان کے تناسب عمر کے لحاظ سے ہوگی) وہ دوبارہ جلدی اس بیماری میں مبتلا نہیں ہوتے۔ لیکن گذشتہ طویل علاج میں بیماری کے عود کرنے کے زیادہ امکانات پائے جاتے ہیں۔ بیماری کے نئے حملے بہت حد تک بیماری کے جراثیم کے دوبارہ پیدا ہو جانے کی وجہ سے ہوتے ہیں لیکن عمومًا ان حملوں کے متعلق غلطی سے یہ تصور کر لیا جاتا ہے۔ کہ بیماری کسی حد تک دور ہونے کے بعد دوبارہ عود کر آتی ہے۔

ریلف کے کولنز نے ان تجربات کا ذکر کرتے ہوئے امریکہ کے اخبار جرنل آف ٹراپیکل میڈیشن (جولائی سنہ ۱۹۳۴ء) میں لکھا ہے۔ "یہ ظاہر ہے۔ کہ کونین کے کم سے کم استعمال سے حیرت انگیز طور پر تسلی بخش نتائج پیدا کئے جا سکتے ہیں"۔

موجودہ صورت میں لیگ آف نیشنز کے ملیریا کمیشن نے یہ قرار دیا ہے۔ کہ حفظ ماتقدم کے طور پر بخار کے موسم میں ہر روز ۶ گرین کونین استعمال کی جائے۔ اور علاج کے لئے بیماروں کو پانچ سے سات روز تک پندرہ سے بیس گرین تک روزانہ کونین کی ایک خوراک دی جائے۔ اس کے علاوہ اور کوئی علاج نہ کیا جائے لیکن بیماری کے دوبارہ عود کر آنے کی صورت میں پھر یہی طریق علاج استعمال کیا جائے۔ (لیگ آف نیشنز کا ملیریا کمیشن)

وصیتیں

نمبر ۴۹۱۷

منکہ محمد فاضل ولد امام دین قوم مغل جرال پیشہ ملازمت عمر تقریباً ۲۵ برس پیدائشی احمدی ساکن شہر جہلم بقائمی ہوش وحواس بلا جبر واکراہ آج تباریخ ۲۲/۱۱/۳۷ حسب ذیل وصیت کرتا ہوں۔

میری جائیداد اس وقت کوئی نہیں۔ اس وقت میری ماہوار آمد مبلغ بیس روپے ہے۔ میں تازیست اپنی ماہوار آمد کا ۱/۱۰ حصہ داخل خزانہ صدر انجمن احمدیہ قادیان کرتا ہوں۔ میرے مرنے کے وقت جسقدر میری جائیداد ثابت ہو۔ اس کے ۱/۱۰ حصہ کی مالک صدر انجمن احمدیہ قادیان ہوگی

العبد :۔ محمد فاضل معرفت سنگر سیونگ مشین ایجنسی کوئٹہ بلوچستان

گواہ شد :۔ مختار احمد ایاز امیر جماعت احمدیہ کوئٹہ

گواہ شد :۔ محمد اسحاق عابد سکرٹری جماعت احمدیہ کوئٹہ

گواہ شد :۔ محمد اسمٰعیل سنگر سیونگ مشین کمپنی کوئٹہ۔

نمبر ۵۰۲۷

منکہ مسماۃ زینب بنت مرزا غلام نبی قوم مغل عمر ۲۰ سال پیدائشی احمدی۔ ساکن حال گوجرانوالہ ابقائمی ہوش وحواس بلا جبر واکراہ آج تباریخ ۱۳/۴/۳۸ حسب ذیل وصیت کرتی ہوں۔

میری اسوقت حسب ذیل جائیداد ہے۔ ایک جوڑی کانٹے طلائی وزنی ۳ ماشہ قیمت نو روپے، ایک سو روپیہ نقد جو میرے والد صاحب نے میرے زیور کیلئے دیا ہوا ہے۔ اس کل مجموعی ۱۰۹ روپے کے ۱/۱۰ حصہ کی میں صدر انجمن احمدیہ قادیان کے حق میں وصیت کرتی ہوں۔ اگر کوئی رقم میں اپنی زندگی میں صدر انجمن احمدیہ کو ادا کرونگی۔ تو وہ اُس میں سے وضع کردی جائے۔ اور اگر میری وفات پر اس جائیداد کے علاوہ کوئی جائیداد ثابت ہو۔ تو اس کے ۱/۱۰ حصہ کی بھی صدر انجمن احمدیہ قادیان مالک ہوگی۔

العبد :۔ زینب بقلم خود

گواہ شد :۔ مرزا غلام نبی والد موصیہ

گواہ شد :۔ محمد بخش میر امیر جماعت احمدیہ گوجرانوالہ

نمبر ۵۰۳۵

منکہ نظیر بیگم بنت فضل الٰہی سیکرٹری تبلیغ قوم جٹ پیشہ ملازمت عمر تقریباً ۲۴ سال تاریخ بیعت دسمبر ۱۹۳۴ء ساکن سیالکوٹ شہر بقائمی ہوش وحواس بلا جبر واکراہ آج تباریخ ۲۳/۳/۳۸ حسب ذیل وصیت کرتی ہوں۔ میں اس وقت ۴۱۵ روپے کے ۱/۱۰ حصہ کی وصیت خدا کے فضل سے اور کامل صحت کے ساتھ کرتی ہوں۔ جسکی تفصیل درج ذیل ہے۔

میں اس وقت احمدیہ مڈل گرلز سکول میں معلّمہ کا کام کر رہی ہوں۔ اور میری ماہوار آمدنی مبلغ ۲۴ روپے ہے۔ اُن میں سے ۲۰ روپے بطور کمیٹی احمدیہ مڈل گرلز سکول میں ہر ماہ ادا کرتی ہوں۔ جن کی تین اقساط ادا کر چکی ہوں۔ میں اس کے علاوہ کمیٹی دار الشکر قادیان میں بطور کمیٹی ۲۱۰ روپے ادا کئے ہوئے ہیں۔ اور پراویڈنٹ فنڈ کی رقوم جو کہ ۱۲۵ روپے بذمہ سکول ہے۔ اور ایک جوڑی کانٹے طلائی جنکی قیمت ۲۰ روپے ہے۔ نیز ان کے علاوہ نہ کوئی منقولہ جائیداد ہے اور نہ غیر منقولہ۔ ہاں اس بات کا اقرار کرتی ہوں کہ اگر میرے مرنے کے بعد اس سے زیادہ جائیداد ثابت ہو خواہ وہ نقدی کی صورت میں ہو۔ یا زیور کی صورت میں۔ یا جائیداد کی صورت میں ہو۔ اس کے ۱/۱۰ حصہ کی مالک صدر انجمن احمدیہ قادیان ہوگی۔ اور اس بات کا اقرار کرتی ہوں۔ کہ انشاء اللہ سکول والے کمیٹی لینے پر اپنی جمع شدہ رقم کا ۱/۱۰ حصہ ادا کرونگی۔ اور کمیٹی ختم ہونے پر اپنی ماہوار آمدنی کا ۱/۱۰ حصہ ادا کیا کرونگی۔ کمیٹی کی میعاد اکتوبر ۱۹۳۸ء ہے۔ اگر اس سے پہلے میری موت واقع ہوجائے تو صدر انجمن احمدیہ قادیان کو حق حاصل ہوگا۔ کہ وہ میرے لواحقین سے ۱/۱۰ حصہ میری رقوم کا وصول کرے۔

العبد :۔ نظیر بیگم معلّمہ گرلز سکول احمدیہ سیالکوٹ

گواہ شد :۔ فضل الٰہی سیکرٹری تبلیغ

گواہ شد :۔ سیدہ رفعت صاحبہ معلمہ احمدیہ گرلز سکول

گواہ شد :۔ سیدہ عصمت ہیڈ ماسٹرس احمدیہ گرلز سکول سیالکوٹ

نمبر ۵۰۱۶

منکہ امۃ العزیز بیگم بنت حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب قوم مغل عمر ۱۸ سال پیدائشی احمدی ساکن قادیان بقائمی ہوش وحواس بلا جبر واکراہ آج تباریخ ۹/۴/۳۸ حسب ذیل وصیت کرتی ہوں۔

اس وقت میری جائیداد منقولہ تقریباً سو روپے کا زیور ہے۔ اور جائیداد غیر منقولہ بصورت چھ گھماؤں زرعی اراضی واقع موضع راجپورہ تحصیل وضلع گورداسپور قیمتی اندازاً دو سو روپیہ یا سوا دو سو روپے ہے۔ اور اس کے علاوہ اس وقت میری کوئی جائیداد نہیں۔ البتہ مجھے حضرت والد صاحب محترم کی طرف سے عشہ روپے ماہوار بطور جیب خرچ ملتے ہیں۔ سو میں اپنی جائیداد منقولہ کا ۱/۳ اور جائیداد غیر منقولہ کا ۱/۱۰ حصہ بحق صدر انجمن احمدیہ وصیت کرتی ہوں اور اپنی ماہوار آمد کا بھی ۱/۵ حصہ صدر انجمن احمدیہ کو ادا کرتی رہونگی نیز میری وفات پر جو بھی جائیداد علاوہ جائیداد مندرجہ بالا کے میری ملکیت ثابت ہو۔ اس کے بھی ۱/۱۰ حصہ کی صدر انجمن احمدیہ مالک ہوگی۔ خواہ جائیداد منقولہ ہو یا غیر منقولہ۔

الامۃ :۔ امۃ العزیز بیگم بقلم خود

گواہ شد : حضرت مرزا محمود احمد

گواہ شد : حضرت مرزا بشیر احمد

نمبر ۵۰۳۱

منکہ غلام فاطمہ بیوہ شیخ حسین بخش صاحب مرحوم قوم شیخ افغان گگے زئی۔ عمر ساٹھ سال تاریخ بیعت ۱۹۰۳ء ساکن دھرم کوٹ رندھاوا ڈاکخانہ خاص تحصیل بٹالہ ضلع گورداسپور حال منٹگمری بقائمی ہوش وحواس بلا جبر واکراہ آج تباریخ ۵/۴/۳۸ حسب ذیل وصیت کرتی ہوں

اس وقت میری جائیداد حسب ذیل ہے۔ نصف قطعہ (نصف احاطہ) سفید زمین رقبہ ۱۰ مرلے واقعہ قصبہ منٹگمری خاص احاطہ نمبر ۲۲ اسلام آباد مالیتی ۱۲ صد روپیہ۔ ایک مکان پختہ ۵۰×۱۰ (۶۰ قریباً) واقعہ دھرم کوٹ رندھاوا تحصیل بٹالہ ضلع گورداسپور جسکا حدود اربعہ (شمال میں شارع عام۔ مغرب میں مکان شیخ احسان علی کنسٹیبل۔ مشرق میں مکان شیخ مہر دین اور مغرب میں گلی) ہے۔ علاوہ ازیں میری جائیداد از قسم سامان خانہ مالیتی یکصد روپیہ ہے۔ اور دو عدد بالیاں طلائی ایک تولہ مالیتی قریباً پچاس روپے ہے۔ میں اپنی مذکورہ بالا جائیداد کے ۱/۱۰ حصہ کی وصیت بحق صدر انجمن احمدیہ قادیان کرتی ہوں۔ اور یہ بھی وصیت کرتی ہوں۔ کہ میری وفات کے وقت جسقدر بھی میری جائیداد ہو۔ اس کے ۱/۱۰ حصہ کی مالک صدر انجمن احمدیہ قادیان ہوگی۔ اگر میں اپنی زندگی میں کوئی رقم یا کوئی جائیداد خزانہ صدر انجمن احمدیہ میں بمد وصیت حوالہ کرکے رسید حاصل کرلوں۔ تو ایسی رقم یا ایسی جائیداد کی قیمت حصہ وصیت کردہ سے منہا کردی جائیگی۔ میرا گذارہ اس وقت میرے پسران کے ذمہ ہے۔ مگر انہوں نے تاحال میرے حقوق کا تصفیہ نہیں کیا۔ کہ وہ مجھے کس قدر گذارہ ماہوار یا ششماہی نقد یا پیداوار کی صورت میں دینگے۔ اس لئے میں گذارہ کی آمد کا تعین نہیں کرسکتی۔ فیصلہ ہو جانے پر جو گذارہ مجھے پسران کی طرف سے ملیگا۔ اس کا بھی ۱/۱۰ حصہ داخل خزانہ صدر انجمن احمدیہ قادیان کرتی رہوں گی۔

العبد :۔ فاطمہ بقلم خود

گواہ شد :۔ نصیر احمد پوسٹل کلرک منٹگمری۔

گواہ شد :۔ شریف احمد بقلم خود کنسٹیبل نمبر ۹۱ منٹگمری

گواہ شد :۔ غلام حسین چاہلوں

نمبر ۵۰۰۷

منکہ جنت بی بی بیوہ چوہدری نظام دین صاحب مرحوم قوم کشمیری عمر ۷۰ سال تاریخ بیعت جنوری ۱۹۳۶ء ساکن پسرور ضلع سیالکوٹ بقائمی ہوش وحواس بلا جبر واکراہ آج تباریخ ۲۸/۲/۳۸ حسب ذیل وصیت کرتی ہوں۔

میری اسوقت کوئی جائیداد از قسم غیر منقولہ یا زیور کے نہیں ہے۔ جو کہ مجھے اپنے خاوند سے ملی ہو۔ میرا گزارہ میرے دو لڑکوں محمد دین و محمد صدیق احمدی غیر مبائع کے ذریعہ ہے۔ جو کہ مجھے خرچ دیتے ہیں۔ اس خرچ میں سے جو وہ مجھے دیتے رہے ہیں میں نے تھوڑا تھوڑا جمع کیا ہے۔ جو کہ نقدی کی صورت میں میرے پاس ایک سو دس روپے کی صورت میں ہے۔ میں اس کے ۱/۱۰ حصہ کی وصیت صدر انجمن احمدیہ قادیان کے حق میں کرتی ہوں جسکو میں اپنی زندگی میں ہی صدر انجمن احمدیہ قادیان کے حوالے کر دونگی۔ اور اگر میری فوتگی کے وقت کوئی اور جائیداد ثابت ہو۔ تو اس کے بھی ۱/۱۰ حصہ کی وصیت بحق صدر انجمن احمدیہ کرتی ہوں۔

العبد :۔ نشان انگوٹھا جنت بی بی بیوہ چوہدری نظام الدین مرحوم خاص پسرور۔

گواہ شد :۔ فضل احمد محرر لوکل فنڈ پسرور

گواہ شد :۔ مولوی محمد عبد اللہ احمدی مولوی فاضل گورنمنٹ سکول پسرور۔

نمبر ۵۰۳۳

منکہ عبد الرحمٰن خان مولوی فاضل ولد مولوی معین الدین صاحب قوم افغان پیشہ ملازمت عمر ۲۶ سال پیدائشی احمدی ساکن قادیان بقائمی ہوش وحواس بلا جبر واکراہ آج تباریخ یکم اپریل ۱۹۳۸ء حسب ذیل وصیت کرتا ہوں

میری اسوقت کوئی جائیداد نہیں۔ البتہ مجھے دفتر الفضل سے بطور الاؤنس ۲۵ روپے ماہوار ملتے ہیں۔ میں اس کا دسواں حصہ ماہ بماہ داخل خزانہ صدر انجمن احمدیہ قادیان کرتا رہونگا۔ نیز میرے مرنے پر جو میری جائیداد ثابت ہو۔ اس کے بھی ۱/۱۰ حصہ کی مالک صدر انجمن احمدیہ قادیان ہوگی۔

العبد :۔ عبد الرحمٰن مولوی فاضل رکن ادارہ الفضل

گواہ شد :۔ محمد یعقوب اسسٹنٹ ایڈیٹر الفضل

گواہ شد :۔ سید احمد مولوی فاضل

نمبر ۵۰۲۳

منکہ عبد العزیز مغل ولد میاں چراغ دین صاحب قوم مغل چغتائی عمر باسٹھ سال تاریخ بیعت ۱۸۹۹ء ساکن احمدیہ مبارک منزل ڈاکخانہ وطن بلڈنگ لاہور ضلع لاہور۔ بقائمی ہوش وحواس بلا جبر واکراہ آج تباریخ ۲۲/۳/۳۸ حسب ذیل وصیت کرتا ہوں۔

میری جائیداد اس وقت کوئی نہیں۔ میری ماہوار آمد تخمیناً ۲۵ پچیس روپیہ ہے۔ میں تازیست اپنی ماہوار آمد کا دسواں حصہ داخل خزانہ صدر انجمن احمدیہ قادیان کرتا رہونگا۔ میرے مرنے کے وقت میری جسقدر جائیداد ثابت ہو۔ اس کے بھی دسویں حصہ کی مالک صدر انجمن احمدیہ قادیان ہوگی۔

العبد : عبد العزیز مغل

گواہ شد :۔ نواب دین سکرٹری وصایا لاہور

گواہ شد :۔ عبد الکریم سیکرٹری مال لاہور۔